ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

FEBRUARY - 1989

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ــــــــــ شمارہ نمبر ۲

فروری ۱۹۸۹ء

- مدیر مسئول ــــــ نور محمد فلاحی
- مرتب ــــــ ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

- سالانہ زر تعاون .... ۳۰ روپئے
- خصوصی تعاون .... ۱۰۰ روپئے
- غیر ممالک سے .... ۱۵ امریکی ڈالر
- فی شمارہ .... ۳ روپئے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افشاں نعیم پریس ... دہلی ... کاتب: رئیس احمد، شاہد ... اعظم گڑھ

فاروقِ اعظم کی بہو

قمر رسولپوری

عمر فاروقِ اعظم وہ دبدبہ تھا جن کی عظمت کا
زمانے کی زباں پر تذکرہ تھا ان کی شوکت کا

یہ تھا معمول ان کا روز راتوں میں نکلتے تھے
جو دنیا نیند میں ہوتی تو حضرت گھر سے چلتے تھے

وہ اک شب جا رہے تھے ان کے کانوں میں صدا آئی
وہیں پر رک گئے آہٹ خلیفہ نے جہاں پائی

کہا دختر سے ماں نے دودھ میں پانی ملا دینا
ملا کر اس میں پانی دودھ کو بیٹی بڑھا دینا

کہا بیٹی نے وہ کل جو منادی کرنے آیا تھا
امیر المومنین کا حکم یہ سب کو سنایا تھا

کہا تھا دودھ میں پانی اگر کوئی ملائے گا
تو ایسے جرم کی بیشک سزا شرعاً وہ پائے گا

سنی یہ بات بیٹی کی تو ماں اس طرح بولی
خلیفہ کو بھلا اس بات کی کیسے خبر ہوگی

خلیفہ ہی یہاں نہ وہ منادی کرنے والا ہے
یہاں تو صرف ہم ہیں اور اپنا بول بالا ہے

کہا بیٹی نے امی مجھ سے ایسا ہو نہیں سکتا
ملاؤں دودھ میں پانی یہ ہرگز ہو نہیں سکتا

یہ مانا اپنا گھر ہے کون ہم کو دیکھتا ہوگا
کوئی دیکھے نہ دیکھے پر خدا تو دیکھتا ہوگا

سنی فاروق نے یہ بات تو دل میں اتر آئی
کہ یہ لڑکی دیانت دار ہے ایماں کی شیدائی

یہ باتیں دل ہی دل میں سوچ کر وہ گھر پلٹ آئے
بنا دے گی یہ لڑکی گھر کو جنت جس کے گھر جائے

فوراً اٹھ کر ضعیفہ کے یہاں پیغام بھجوایا
قرابت کے لئے بڑھیا کو اپنے پاس بلوایا

کہا تم اپنی دختر کو خوشی سے گر مجھے دیدو
کروں گا عقد بیٹے کا میں اپنے تم اگر چاہو

وہ عورت ہو گئی حیرت زدہ اس بات کو سن کر
غریبی کے دنوں میں جیسے مل جائیں زر و گوہر

مسرت کی اٹھی اک لہر اس کے گوشۂ دل سے
خوشی کے چند کلمے پھر زباں شوق سے نکلے

سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے حضرت سے یوں بولی
امیر المومنین کی جو رضا ہے وہ رضا میری

خوشی سے یہ ہوا کہ تم جب چاہے ادا کیجے
مری بیٹی کو جب چاہے بہو اپنی بنا لیجے

ہوا یہ عقد عالیشان اسلامی اصولوں سے
نہ باجوں سے نہ گانوں سے نہ جہیز و لینے دینے سے

بہو بن کر خلیفہ کی وہ لڑکی ان کے گھر آئی
قناعت فقر و فاقہ کے تحائف ساتھ میں لائی

فقط اس بات کو ہم بھی سمجھ لیتے تو اچھا تھا
جو ہم میں غیر شرعی رسمیں مٹا دیتے تو اچھا تھا

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

اِن کنتم مؤمنین — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

مقالات

داعیانِ اسلام اور مختلف طریقہائے دعوت — شیخ علی طنطاوی — ۱۰

بحث و نظر

قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ؟ — ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی — ۲۸

تصویرِ جہاں

۱۹۸۸ء کی کچھ تلخ اور شیریں یادیں — قاضی زین العابدین — ۳۱

عظمت کے مینار

حضرت ابوذر غفاریؓ — ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا — ۳۷

شعر و نغمہ

فاروقِ اعظم کی بہو۔ آزاد ہند — قمر دعولپوری، شیخ منفعت مبارکپوری

تعلیم و تعلم

امام رازیؒ اور "مفاتیح الغیب" — عبدالبر اثری فلاحی — ۴۳

دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل — شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، عبدالرزاق عتیقی — ۵۳

تعارف و تبصرہ

فکرِ آخرت اور اسلامی انقلاب — نعیم الدین اصلاحی — ۵۵

جامعہ کے لیل و نہار

مہمانانِ گرامی کی آمد — برادر صبیح ایوبی کو صدمہ — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۵۷

اداریہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

اِن کُنتُم مُؤمِنِین......

ہم پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو بیرونی اقتدار سے آزاد ہوئے اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کی صبح ہمارا دستور بن کر نافذ ہوا جس میں دوسروں کے ساتھ ہمیں بھی ہمارے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور یہ ہم پر کوئی احسان نہیں تھا، یہ ہمارا حق تھا۔ ہم اس ملک کے ویسے ہی اصل باشندے تھے جیسے کوئی دوسرا۔ ہم یہیں کے ہیں اور یہاں سے آباء و اجداد بھی یہیں کے تھے۔ پھر آزادی کی جنگ میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ خیال تھا کہ آزادی کی فضا میں ہم سانس لیں گے اور آزاد فضاؤں میں پرواز کر سکیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آج ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء ہے، دستور نافذ ہوئے پورے انتالیس سال مکمل ہو رہے ہیں۔ کیا کوئی ایسا میدان ہے جس میں ہمیں نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔ سرکاری ملازمتوں میں ہمارا تناسب نہیں کے برابر ہے، نصاب کی کتابوں میں صرف ایک فرقہ کی ثقافت کو ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہے، اسلام کو اولاً کوئی نمائندگی نہیں دی گئی اور اگر کچھ دی بھی گئی تو بس اس طرح کہ اس کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ ہماری تعلیم گاہوں کو جنہیں ہم نے قائم کیا تھا ہم سے چھیننے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، بعض کو چھین لیا گیا اور بعض کے سلسلہ میں سازشوں کا تانا بانا بنا جا رہا ہے۔ اردو جو ہندو مسلم ملاپ کا بہترین ذریعہ تھی، جو محبت اور بھائی چارگی کا نشان تھی، اس کو مسلسل نظر انداز کیا گیا۔ اپنی کتنی عبادت گاہوں سے ہم بے دخل کیے گئے اور ابھی ایک لمبی فہرست باقی ہے جس سے بے دخل کرنا منصوبہ میں شامل ہے۔ بے اطمینانی و بے اعتمادی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ شکوک و شبہات اور بدگمانی کی شدید گھٹا گھر چکی ہے اور نفرتوں اور عداوتوں کے مہیب بادل اچھلتے ہوئے آئے اور یہ بادل آگ کے شعلے برساتے چلے جا رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، پڑوسی پڑوسی کے درپے آزار ہے، اطمینان اٹھ چکا، اختلاف غالب ہو گیا، محبتوں کی جگہ نفرتوں نے

ہے، بھائی بھائی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، پڑوسی پڑوسی سے خائف ہے، فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں نہ جانے کتنے گھر ویران، کتنے خاندان تباہ اور کتنی املاک برباد کر دیں اور اس سارے کھیل میں حکومت خاموش تماشائی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر شرپسندوں کی حامی اور پشت پناہ ہے۔ حالات کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ ایک منصوبہ بند سازش ہے کہ یا تو ہم مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ملک چھوڑ دیں یا اپنے تشخص سے محروم ہو کر ان کی تہذیب میں گم ہو جائیں یا پھر تیسرے درجہ کے شہری کی حیثیت سے رہنا گوارہ کر لیں۔

خوف و دہشت کے یہ سائے، نفرت، کشمکش اور ٹکراؤ کی یہ فضا، بے اطمینانی و بے اعتمادی، بدگمانی اور شکوک و شبہات کا یہ ماحول، یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہو گیا اور نہ یہ اتفاقات زمانہ کا نتیجہ ہے۔ یہ فضا بالقصد پیدا کی گئی اور یہ ماحول جان بوجھ کر بنایا گیا ہے جس کی پلاننگ بہت پہلے کی گئی تھی۔ ٹکراؤ اور تصادم کی اس فضا سے وہ تین فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ یہ معلوم ہے کہ ہندو قوم کو جوڑنے اور متحد رکھنے کے لئے ان کے پاس کوئی مثبت بنیاد نہیں ہے۔ ان کی فرقہ پرست قیادت کشمکش کی فضا پیدا کر کے منفی بنیادوں پر انھیں جوڑنا اور اپنا اقتدار ان پر باقی رکھنا چاہتی ہے۔

چنانچہ وہ اپنے اس منصوبہ میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس نے اپنی جڑیں اپنے سماج میں بڑی گہری کر لی ہیں اور پوری فضا کو مسموم کر ڈالا ہے۔ ہندو بھائیوں کی اکثریت امن پسند ہے لیکن موجودہ فضا میں ایک بڑی تعداد کا ذہن مسموم ہو چکا ہے اور اب بابری مسجد کی جگہ مندر کی تعمیر کے لئے ملک بھر سے اینٹوں کو اکٹھا کرنے کا منصوبہ آگ پر تیل ڈال رہا ہے۔

۲۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے یہاں مذہب کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ ان کا سماج بدترین قسم کے باہمی ظلم، عدم مساوات اور اونچ نیچ کا شکار ہے۔ انھیں ڈر ہے کہ اگر ماحول پرسکون رہا تو ان کے افراد تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائیں گے۔ اس بنا پر ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ ماحول کو ممکن حد تک گرم بنائے رکھو اور نفرت کی شراب سے بدمست کر دو تاکہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کر ہی نہ سکیں۔ اور ہم ان کے بوئے ہوئے کانٹوں ہی کو

صاف کرتے رہیں، اصل مقصد کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملے اور ہماری اعلیٰ ترین ٹھوس صلاحیتیں تعمیری کام کے بجائے یوں ہی ضائع ہوتی رہیں۔

۳۔ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے کنگال، معاشرتی اعتبار سے پسماندہ، اور تعلیمی لحاظ سے صفر کر کے ان کو نہ صرف بے حوصلہ کر دیا جائے بلکہ اتنا خوف زدہ کیا جائے کہ یا تو وہ مرعوب ہو کر ملک سے بھاگ کھڑے ہوں یا ان کی تہذیب میں ضم ہو جائیں یا پھر تیسرے درجہ کے شہری کی حیثیت سے رہنا گوارہ کر لیں۔

۴۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت حد تک اطمینان ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ ہند نے زندگی کا وہ ثبوت فراہم کیا ہے جو اس کے شایان شان تھا۔ کوئی دوسری ملت ہوتی تو ظلم و بربریت کے اتنے کچوکے، ان ناانصافیوں کے اتنے صدمے برداشت نہیں کر پاتی۔ ان تشویشناک اور کرب انگیز حالات میں اس کے نوجوانوں اور قائدین کا اضطراب اور ان مسائل سے نمٹنے کے لئے تگ و دو نہ صرف بجا ہے بلکہ دین سے ان کے گہرے تعلق کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ ملت بحیثیت ملت مردہ نہیں ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے بہت پہلے آسمان کے تیور پہچان لئے تھے اور حالات کے رخ کو بھانپ لیا تھا۔ ان کے بس میں جو کچھ تھا انھوں نے کیا۔ حالات ہی اتنے شدید اور بھیانک تھے کہ ہم ان سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے ہم ان کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انھیں خراج تحسین پیش کرتے اور اللہ سے ان کی فروگذاشتوں کے لئے معافی طلب کرتے ہیں۔

اس اعتراف کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان حالات یا ان سازشوں نے نوجوانوں اور بزرگوں کی ساری صلاحیتوں کو نچوڑ لیا اور ان کی توجہ بعض استثناءات کے ساتھ اس کام کی طرف نہیں ہو سکی جو اصل کرنے کا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا سانحہ یہ بھی رہا کہ ہمارے درمیان سے کوئی ایسی قیادت ابھر کر سامنے نہیں آسکی جس کے گرد پوری ملت یا اس کی عظیم اکثریت مجتمع ہو سکتی۔ اس کے برخلاف ہم نے بعض "رہنماؤں" کو اقتدار کے لئے رسہ کشی کرتے، ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے اور ٹانگ پکڑ کر کھینچتے دیکھا۔

ہم اپنی صفوں میں ایسے دینی اور قوتوں سے بھی بے خبر نہیں ہیں جو وقت کے غلام اور مفاد کے بندے ہیں۔ جب ضرورت ہوئی انھیں خرید لیا گیا۔ ان ہی کے ذریعہ ہماری صفوں میں تفرقہ و انتشار پیدا کیا گیا بلکہ ہم پر بندوق چلانے کے لئے ان کے کندھوں کو استعمال کیا گیا۔

ہمارے ساتھ ایک المیہ یہ بھی رہا کہ ہم منصوبہ بند طریقہ سے، حکمت کے ساتھ، مستقل طور پر کوئی ٹھوس کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم ہنگامی کاموں اور جذباتی نعروں کے پیچھے آنکھ بند کر کے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں نکاح و طلاق کے اسلامی قوانین پر عمل کرنے سے کون روکتا ہے؟ اپنے اداروں میں اسلامی کردار اختیار کرنے اور اسے فروغ دینے میں کون مانع ہے؟ مسجدیں اپنی ویرانی پر کیوں مرثیہ خواں اور ماتم کناں ہیں؟ ہے ان کا کوئی جواب؟!!

ہمارے خلاف سازشوں کا یہ جال ہے اور ہماری صفوں کا یہ حال ہے۔ ہماری قیادت کو بنظر غائر دونوں کا جائزہ لے کر آئندہ کے لئے لائحۂ عمل تیار کرنا اور ان حالات سے نکلنے کے لئے ذہن پیدا کرنی ہوں گی۔ ملک کی رائے عامہ کو بیدار کرنا ہوگا اور ایک طویل اخلاقی، آئینی اور عدالتی جنگ لڑنی ہوگی اور اس جنگ کا رُخ کسی فرقہ کی طرف نہیں، حکومت کی جانب داری اور شرپسند عناصر کے شر کی طرف ہوگا۔ ہمیں اشتعال دلایا جائے گا لیکن اشتعال سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کرنی ہوگی اور ٹکراؤ کو جہاں تک ہو سکے نظر انداز کرنا ہوگا، اپنے نوجوانوں کو ٹھنڈا بھی رکھنا ہوگا اور ان کے حوصلوں کو سرد ہونے سے بچانا بھی ہوگا۔

اشتعال اور ٹکراؤ سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر اور کوشش کے باوجود اگر ہمارے دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو سے کھیلا جاتا اور ہمارے حوصلے کو للکارا جاتا ہے تو پھر ہمیں مدافعت کا بھرپور حق ہے، انسانی، اخلاقی، آئینی اور دینی حق۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد۔ (مسند احمد جلد اول ص [illegible] الطبعة الثانية المكتب الاسلامي للطباعة والنشر بيروت) "جو شخص اپنے مال، اپنے گھر والوں، اپنے دین اور اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔"

صلح حدیبیہ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ صلح کے اس مختصر سے عرصہ میں جتنے افراد اسلام کی آغوش میں آئے وہ اس سے کہیں زیادہ تھے جتنا کشمکش اور جنگ کے دوران آئے۔ بلاشبہ یہ محبت اور امن کی فضا کا کرشمہ تھا کہ لوگوں کو سنجیدگی سے سمجھنے کا موقع ملا لیکن یہی واقعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سے پہلے ایسے حالات تھے کہ کشمکش پسندیدہ نہ سہی ناگزیر ضرور تھی جس کی وجہ سے برسوں جنگ کی فضا قائم رہی، لیکن کسی بھی اقدام سے پہلے ہمیں اس پر نظر رکھنی ہوگی کہ اس مدافعت میں ہمارے اصل مقصد کا کم سے کم نقصان ہو اور ہندوستان بھر میں بکھری ہوئی ملت کا تحفظ خطرہ میں نہ پڑے۔

اور دوسری یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے رہنی چاہئے کہ اعوان و انصار اور تعداد و وسائل کی قلت و کثرت سے بڑھ کر اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمارے ایمان کی کیفیت کیا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارا ایمان مردہ ہو چکا ہو اور اس سے زندگی نکل چکی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين۔ تمہیں ہی سربلند ہونا ہے اور تمہاری سربلندی کا راز تمہارے ایمان میں مضمر ہے۔ ایمان اگر زندہ ہے تو تم زندہ ہو اور اگر اس سے روح نکل چکی ہے تو تمہاری بھی حیثیت ایک لاشِ بے جان سے زیادہ نہیں۔ ارشادِ رسول ؐ ہے:

"میری امت پر عنقریب وہ وقت آجائے گا جب دوسری قومیں اس پر اس طرح سے ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دسترخوان پر گرتے ہیں۔ کسی کہنے والے نے کہا: اے اللہ کے رسول ؐ! جس دور کا حال آپ بیان فرما رہے ہیں کیا اس دور میں ہم مسلمان اتنی کم تعداد میں ہوں گے کہ ہمیں نگل جانے کے لئے قومیں متحد ہو کر ٹوٹ پڑیں گی؟ آپ ؐ نے فرمایا نہیں۔ اس زمانہ میں تمہاری تعداد کم نہ ہوگی بلکہ تم بہت بڑی تعداد میں ہو گے لیکن تم سیلابی جھاگ کی طرح ہو جاؤ گے (بے وزن، بے قیمت) تمہارے دشمنوں کے سینہ سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی اور تمہارے دلوں میں پست ہمتی گھر کر لے گی۔ ایک آدمی نے پوچھا: یہ پست ہمتی کس وجہ سے آئے گی اے اللہ کے رسول ؐ! آپ ؐ نے فرمایا: اس وجہ سے ہوگی کہ لوگ "دنیا" سے محبت کرنے لگیں گے اور (شہادت کی راہ میں) موت سے نفرت و کراہیت پیدا ہو جائے گی۔" (ابوداؤد، بحوالہ "سفینۂ نجات" ص ۲۲۳)

ان تمام مراحل میں اصل کام کی طرف سے غافل نہیں ہونا ہے بلکہ پوری توجہ اسی کام پر مرکوز کرنی ہے جس کی طرف سے تحفظات ہی نے ہمارے راستے میں یہ کانٹے بوئے تھے۔ میری مراد اندرونی اصلاح اور شہادت حق سے ہے کہ یہی اس ملت کے وجود کا مقصد اور اس فریضہ کی ادائیگی، سارے مسائل کا حل اور آخرت کی کامیابی کی کلید ہے۔ اس کے لئے ہمیں نفرت کو ختم کرنا اور محبت و اتحاد کی فضا پیدا کرنی ہوگی اور اس بات کو ذہنوں میں رکھنا ہوگا کہ فرقہ پرستوں کا اصل ہدف یہی ہے کہ محبت و اخوت کی وہ فضا پیدا ہی نہ ہو کہ برادران وطن اس دعوت کو سمجھ سکیں اور ان کو ان کے اسی ہدف میں ناکام کرنا ہماری اصل کامیابی ہے۔

پچھلے شمارہ میں ہم نے مولانا ابو العرفان ندوی مرحوم پر اپنے گہرے رنج کا اظہار کیا تھا کسے خبر تھی کہ سیاہی خشک بھی نہیں ہوگی کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے محترم و ہر دلعزیز استاذ مولانا ضیاء الحسن صاحب قاسمی، ندوی کا بھی بلاوا آجائے گا۔ مرحوم ۱۹۵۱ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء سے ادب میں تخصص کیا۔ مفتاح العلوم مئو میں تدریسی خدمات انجام دیں پھر مظہر العلوم بنارس میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ ادھر عرصہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ کچھ دنوں سے مستقل بیمار تھے، گردہ خراب ہو چکا تھا، ذیابطیس اور بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ علاج و معالجہ سے کوئی افاقہ نہیں ہو پایا اور ۲ جنوری ۱۹۸۹ء کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ مغفرت کرے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ملت کو بہترین بدل عطا کرے۔

مولانا ضیاء الحسن مرحوم کو جامعۃ الفلاح سے خصوصی لگاؤ تھا اور اس کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک چھوٹے بھائی مولوی نیاز احمد صاحب کی تعلیم و تربیت کے لئے جامعۃ الفلاح کا انتخاب کیا۔ برادر موصوف کے جامعہ کے ساتھ خصوصی تعلقات اب بھی برقرار ہیں وقتاً فوقتاً جامعہ آتے رہتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی اطلاع ملنے پر جامعہ میں مرحوم کی صحت کے لئے اجتماعی دعا کی گئی۔ وفات کی خبر آنے کے بعد جہاں صدر جامعہ مولانا

محمد طیب صاحب اصلاحی نے مسجد میں طلبہ و اساتذہ کو روک کر اپنے غم انگیز تاثرات کا اظہار فرمایا اور اجتماعی دعائے مغفرت کی وہیں اپنے دلی جذبات ظاہر کرتے ہوئے سکریٹری انجمن جاوید اشرف فلاحی نے اسے ملت کے لئے بھاری نقصان قرار دیا۔

صدر جامعہ کی قیادت میں مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی، مولانا سلامت اللہ صاحب اصلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی اور مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی پر مشتمل ایک وفد مولانا مرحوم کے گھر گیا اور گھر کے لوگوں سے اظہار تعزیت کیا۔

قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ برادر ولی اللہ سعیدی فلاحی مجلہ "حیات نو" کی توسیع اشاعت کے لئے مہاراشٹر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے واپس آگئے ہیں۔ یہ دورہ بہت حد تک اطمینان بخش رہا اور اندازہ ہوا کہ علم دوست حضرات اب بھی کم نہیں ہیں۔ اس دور بے مذاقی میں ایسے افراد کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے جو سطحی، گھٹیا اور چٹخارے دار چیزوں کے بجائے اصلاحی، تحقیقی، ٹھوس اور سنجیدہ چیزیں تلاش کرتے اور پسند کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے اور اس طرح کے سنجیدہ رسالوں کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے۔

اس دورے میں جن بھائیوں اور بزرگوں نے دست تعاون بڑھایا، مشورے دیئے، وقت نکالا، اہل علم و خیر حضرات تک پہنچنے میں رہنمائی کی، ہم سب کے شکر گزار ہیں اور دعائے خیر کرتے ہیں۔

برادر موصوف اب لکھنؤ، رامپور، بدایوں، علی گڑھ، کانپور اور دہلی وغیرہ کے دورے پر نکل چکے ہیں۔ ہم اپنے ہمدردوں، بہی خواہوں اور علم دوست حضرات سے امید کرتے ہیں کہ وہ مجلہ کی توسیع میں حصہ لے کر اس فکر کو عام کرنے میں شریک اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔ آئندہ اور عنقریب بھی دورے پیش نظر ہیں جن کی تفصیل ہم بعد میں لکھیں گے۔ ••

تصحیح

جنوری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں غلطی سے جلد نمبر ۳ اور شمارہ نمبر ۱۳ لکھا گیا ہے حالانکہ جلد ۲ اور شمارہ ۵ لکھا جانا چاہئے تھا۔ قارئین کرام اپنے پرچوں میں اصلاح فرمالیں۔ (ادارہ)

داعیانِ اسلام اور مختلف طریقہائے دعوت

تحریر: شیخ علی طنطاوی ... ترجمہ: اقبال مسعود ندوی، ریسرچ اسکالر جامعہ ام القریٰ

عالم عرب کے مشہور دانشور، ماہر فقہ و قانون سازی، مورخ، ادیب، مصنف اور مقرر شیخ علی طنطاوی ۶۰ سال سے میدانِ عمل میں ہیں۔ بے شمار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مضامین کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ۲۲ سال سے سعودی ٹی وی پر دینی مسائل پر اس قدر دلنشیں انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ سروے کے مطابق ان کا یہ پروگرام سب سے مقبول شمار ہوتا ہے۔ عربی روزنامہ "الشرق الاوسط" میں ایک ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ "فکر و خیالات" کے نام سے۔ اسی کالم کے تحت انھوں نے اس موضوع پر لکھا۔ اس کا ترجمہ نذرِ قارئین ہے۔ (مترجم)

مجھے ایک صحیح حدیث یاد ہے جو اپنی شہرت کے اعتبار سے زبان زد عام ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے آغاز میں ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے"۔ مجددین عالم اسلام کے بہت سے علاقوں میں ابھرتے رہے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والے بے شمار ہیں اور رہے ہیں۔ میں نے ان سب کی سیرت و جدوجہد کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کی دعوت کے انداز کا جائزہ لیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان سب کا بنیادی اصول اور مقصد ایک رہا ہے۔ سب نے کتاب و سنت سے رہنمائی کو بنیادی اصول شمار کیا ہے اور سب کا مقصد اس امت کا رشتہ اس کے دین سے استوار کرنا ہے۔

مگر ان کے راستے اور انداز کار مختلف رہے ہیں اور ہر ایک نے ایک راستہ یہ سمجھ کر اختیار کیا ہے کہ وہ اس راستے سے اپنے اصولوں کی حفاظت کرتا ہوا مقصد کو پا لے گا۔

میں نے ان سارے مختلف راستوں کو ٹٹولا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سارے راستے آگے جا کر دو مرکزی شاہراہوں سے جا ملتے ہیں جن سے اور راستے بھی پھوٹتے ہیں۔ یہ دو مرکزی شاہراہیں اس طرح سے ہیں:

۱- دعوت الی اللہ کا یہ راستہ منتخب کیا جائے کہ حکمران کی اصلاح کو داعی اپنا (Target) ہدف بنائے اور اس کی اصلاح کی کوشش میں لگ جائے۔ اس کی بہترین مثال مجدد الف ثانی احمد سرہندی کی ہے، جب مغل حکمران اکبر کا رویہ اسلام مخالف ہوتا گیا جس کی وجہ سے عام لوگوں تک برائی کے اثرات پہنچ گئے۔ پھر اس کے ساتھ تو جو بھی سرکردہ شخصیتیں تھیں، مال و سلطنت کی طاقت اس کے ہاتھ میں تھی اور قوم بالکل بے دست و پا تھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی تھی۔ ایسی صورت حال کو سامنے رکھ کر مجدد صاحب نے دعوت کا یہ انداز اختیار کیا کہ وہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ لوگوں سے ملتے اور جس شخص میں بھی خیر دیکھتے اس کو اسلام کی دعوت پہنچاتے اور اس امید میں رہتے کہ وہ یا اس کی اولاد میں سے کوئی اسلام کی خدمت کے لئے تیار ہو جائے گا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کی دعوت کو پھیلایا۔ یہاں تک کہ ایک غیر معمولی نتیجہ سامنے آیا کہ ایک مرتد بادشاہ کی اولاد سے ایسا بادشاہ ابھرا جو مسلمان بادشاہوں میں سب سے بہتر تھا اور جس کے اخلاق، تقویٰ، سیاست و امور سلطنت سے واقفیت اور اصلاح و معاشرے کے اعتبار سے اس کو خلفائے راشدین کا پرتو قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری مراد عالمگیر اورنگ زیب سے ہے۔

اس دعوت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مدت زیادہ نہیں لگتی اور فائدہ جلد ظاہر ہو جاتا ہے اور نتائج مختصر کوشش سے ہی نکلنے لگتے ہیں۔

مگر اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا فائدہ اسی وقت تک ہے جب تک وہ نیک حکمران برسر اقتدار ہے۔ اگر اس جیسا پھر حکمران نہ آئے تو اس دعوت کے برگ و بار بھی مرجھا جاتے ہیں۔

۲- دوسری شاہراہ یہ ہے کہ دعوت کو عوامی اور ملک گیر ہو مگر اس کو حکمران کی حمایت اور

تائید حاصل ہو تاکہ اس دعوت کو پھیلانے کا کام تو داعی کرے مگر اس کو تحفظ تلوار سے حاصل ہو۔

اس انداز کار کی بہترین مثال نجد کے مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب ہیں جن کی دعوت اہل نجد میں پھیلتی گئی اور ساتھ ساتھ انھوں نے سلطان سعود کو بھی اپنا ہمنوا بنایا اور دعوت کا محافظ بننے پر آمادہ کیا۔

اس طرح اس انداز سے دعوت کو دو فائدے حاصل ہوئے قوم میں دعوت پھیلنے کا کام جاری رہا اور حکمراں کے تحفظ سے دعوت ناکامیوں سے بچی رہی۔

۳۔ عوامی دعوت کی شاہراہ، مگر اس انداز سے کہ دعوت کا تحفظ مسلح انقلابی طاقت کرے۔

اس کی بہترین مثال سید احمد بریلوی شہید کی تحریک ہے۔ آپ نے اپنے حامیوں کو مسلح کر کے اعلان جہاد کیا اور شمالی ہند میں ایک اسلامی حکومت قائم کر کے وہاں سے پورے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرا کے اسلامی ملک بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ کتاب و سنت کی بالادستی انفرادی زندگی پر بھی ہو اور اجتماعی و سیاسی معاملات پر بھی ہو۔ ان کی کوشش رنگ لے آتی مگر فوجی میدان میں ناکام انگریز عیاری و مکاری کے راستے سے اس تحریک کو ختم کروا دیتے ان کی عیاری نے خود مسلمانوں سے اس تحریک کو ختم کروا دیا۔ اس طرح وہ تحریک اسلام کے لئے قربان تو ہو گئی مگر ہندوستان اسلام کی نعمتوں سے مستفید ہونے سے محروم رہ گیا۔

فلسطین میں اسی انداز سے شیخ عزالدین قسام شہید مجاہدانہ دعوت لے کر اٹھے تھے۔ یہ ابتدائی دور میں درس حدیث دیا کرتے تھے اور جہاد کی فضیلت پر عالمانہ انداز سے روشنی ڈالتے تھے مگر اللہ کے سامنے حاضر ہو کر جب ان سے پوچھا جائے گا کہ ایک مسلم ملک پر دشمنان اسلام کا غلبہ ہو رہا تھا اور وہ درس جہاد پڑھانے کے بعد گھر میں عام مشغولیات سے نکل کر اس فریضہ کو ادا کرنے خود بھی نکلے تھے کہ نہیں؟ یہ سوچ کر ان کے شب و روز ہی بدل گئے۔ اب وہ ایک مجاہد اور تحریک جہاد کے قائد بن چکے تھے۔ انگریز جس طرح سے فلسطین یہودیوں کو سونپ رہے تھے اس کی ہر سطح پر انھوں نے مخالفت کی اور جہاں موقع ملا وہاں تقریر کی تنظیم قائم کی۔ جہاں ضرورت پڑی وہاں جہاد کا علم سنبھالا۔ یہاں تک کہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اور دوسرے لوگوں اور شاگردوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور اس سرزمین کو اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں اس قوم نے وہ قربانیاں دیں جو بے مثال ہیں۔ نہ سامان نہ افراد

سوالات کا شافی جواب دیا جائے، مسائل کا حل بتایا جائے۔

عالم عرب میں اس کی سب سے نمایاں اور اولین مثال شیخ محب الدین خطیب ہیں جن کو مصر میں جدید اصلاحی تحریکات کا اولین رہنما قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسلام کی خدمت کے لئے سب سے پہلے ان کا قلم اٹھا تھا اور ان کا پریس دینی خدمات کے لئے وقف تھا پھر ان کا جاری کردہ ماہنامہ "الفتح" سب سے پہلا اسلامی پرچہ تھا۔

اسی طرح علامہ شکیب ارسلان نے بھی اپنے قلم سے اسلام کا دفاع کیا تھا۔

عصر حاضر کی سب سے ہمہ گیر اور مقبول ترین دعوتیں

عالم اسلام میں اس وقت دو اسلامی دعوتیں تحریکیں سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کے ماننے والے اور ہمنوا سب سے زیادہ ہیں۔ ایک ہندوستان کی دعوت "جماعت تبلیغ" دوسری مصر کی "اخوان المسلمون" ہے۔

میں یہاں مولانا مودودی کی "جماعت اسلامی" کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہوں کیونکہ وہ میری رائے میں تمام اسلامی تنظیموں میں سب سے زیادہ نکھرے افکار اور خیالات رکھنے والی جماعت ہے۔ کتاب و سنت سے رہنمائی میں اس کا طریق کار سب سے زیادہ قابل اطمینان ہے۔ میں نے اس کا تذکرہ اس لئے چھوڑا ہے کہ اس کے ماننے والے کم ہیں۔ [۱]

---

[۱] شیخ علی طنطاوی کو جماعت اسلامی کے کام کی وسعت کا اندازہ شاید اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ موصوف برصغیر ہند میں جماعت اسلامی کے کام سے براہ راست واقف نہ ہو سکے حالانکہ جماعت اسلامی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا میں باقاعدہ منظم اور ٹھوس انداز سے جد و جہد کر رہی ہے اور اس کے افراد عرب ممالک سمیت دنیا کے مختلف حصوں اور گوشوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ارکان کی تعداد تقریباً بیس ہزار اور متفقین و ہمدردان کئی لاکھ ہیں۔

جماعت اسلامی بھی انفرادی ملاقاتوں، اجتماعات، تصنیف و تالیف، اخبارات و مجلات اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عامۃ الناس اور تعلیم یافتہ طبقہ کی اصلاح و تربیت کے ساتھ اہل سیاست اور ارباب اقتدار کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتی ہے۔ (ادارہ)

مگر قربانیاں کم نہ تھیں۔ یہ مشن ضرور کہ میدان سے ہٹتا رہتا اگر بعد کے رہنما اسلام سے وابستہ رہتے اور اب پھر اسلام کا جھنڈا بلند ہوا ہے تو تحریک میں جان پڑ رہی ہے۔

۴۔ دعوت بذریعہ اشاعت افکار کی شاہراہ، اس انداز کار میں عام افراد تک دعوت پہونچانا اہم ہے۔ جہاں ان سے ملا جا سکے۔ مجلسوں میں، چائے خانوں میں، راستے میں، اجتماعات میں، غرض عام فہم انداز سے اور زمان و مکان کی رعایت سے اسلام کی بات کی جائے تاکہ ان کی اسلام سے وابستگی پیدا ہو۔

اس انداز کار میں بحث و مباحثہ، مناظرہ بازی کا گذر نہیں۔ جمال الدین افغانی کے ایک جملے میں اس دعوت کا مقصد ہے کہ "اپنی بات کہو اور آگے بڑھ جاؤ۔"

الجزائر کے علامہ طاہر جزائری کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی نے ان کی مخالفت کی تو وہ انتہائی تواضع کے ساتھ اعتراف کرتے کہ ان کا مطالبہ غلط ہو سکتا ہے اور شاید وہ صحیح بات سمجھ نہیں سکے ہیں پھر وہ ایک کتاب اس مخالف کو دیتے کہ میں نے اس کتاب سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ آپ اس کو پڑھ کر بتایئے کہ صحیح بات کیا ہے اور کیا یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کو اپنے پاس رکھا جائے؟

کچھ دن تک وہ کتاب مخالف کے پاس رہتی اور عام طور سے ایسا ہوتا کہ وہ کتاب پڑھنے کے بعد ان کی تائید کرنے لگتا۔

یہ نتیجہ ایسا ہے کہ اس میں کامیابی یقینی ہے مگر یہ ہے بڑا لمبا اور صبر آزما، کیونکہ اس کے نتائج خاصی مدت کے بعد سامنے آتے ہیں۔

۵۔ دعوت بذریعہ تصنیف و تالیف کتب، تاکہ کتابوں کی اشاعت سے دعوت پھیلے اور سلسلہ بڑھتا بھی جائے، لکھا ہوا محفوظ بھی رہے۔

اس کی مثال ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے تصنیفی کام میں دیکھی جا سکتی ہے اور مصر میں شیخ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا کے علمی اور اصلاحی کاموں میں نیز الجزائر کے شیخ عبد الحمید بن بادیس کی علمی خدمات میں یہ انداز نمایاں ہے۔

۶۔ دعوت بذریعہ اخبارات، مجلات اور دیگر ذرائع ابلاغ، اس طرح کہ مقالات اور مضامین سے اسلام کی تعلیمات اجاگر کی جائیں، اعتراضات کا جواب دیا جائے، ذہنوں کو الجھانے والے

ہندوستان کی دعوتی تحریک کے بانی مولانا الیاس تھے اور ان کا انداز دعوت یہ تھا کہ وہ اپنے پیروکاروں سے اپنے کام کے لئے وقت مانگتے تھے۔ ہفتہ میں ایک گھنٹہ، مہینہ میں ایک دن، سال میں ایک مہینہ اور عمر بھر میں چار ماہ۔

یہ لوگ دعوت کے لئے دنیا کے کونے کونے جاتے ہیں، اپنے اخراجات خود برداشت کرتے ہیں، کسی سے نہ مدد لیتے ہیں نہ قبول کرتے ہیں۔ اسلام کا پیغام مسلمانوں کو پہنچانے میں لگے رہتے ہیں کیونکہ اس وقت خود مسلمان اسلام سے نا آشنا ہیں اور ان کی اصلاح وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ہندوستان سے نکل کر یہ لوگ اور ملکوں میں بھی پہنچے ہیں۔ مصر و شام اور عراق میں ان کا کام دیکھا جا سکتا ہے۔ مکہ میں ان کے افراد سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ یہ لمبے علاقے پیدل طے کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک پیدل گئے اور وہاں سے یمن اس طرح پہنچے اور صحرا کے بدوؤں کو اسلام کا بھولا سبق یاد کرایا کیونکہ وہ اسلام پہنچا کر خود بھول گئے، اور ہندوستان سے آنے والوں نے ان کو ان کا اپنا پیغام سنایا۔

یہ لوگ اخلاص اور تقویٰ کے پیکر ہیں۔ عمل اور قوت عمل کے نمونہ ہیں اور بلند ارادہ و عالی ہمت ہیں۔

دوسری دعوت "اخوان المسلمون" کی دعوت ہے۔ یہاں اس کا تعارف ذرا تفصیل سے کراؤں گا۔ اس کے انداز دعوت کی بات بھی ہوگی۔ اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی ہے اس کا ذکر ہوگا اور جو باتیں مجھے پسند ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔

ایک طرف اس تحریک کے انداز کار میں پچھلے تینوں دعوتی اسالیب کا اجتماع ہو گیا ہے دوسری طرف یہ ان سب اسالیب سے کچھ اور آگے کے ذرائع بھی اختیار کرتی ہے۔

یہ آغاز میں ایک انفرادی دعوت ہے۔ ایک مختصر بات سے اس دعوت کا آغاز ہوتا ہے جو کہیں بھی ہو سکتی ہے مجلس میں، مدرسہ میں، راستے میں، گاڑی میں۔ یہ کام افغانی اور جزائری بھی کرتے تھے مگر وہ زمین میں بیج ڈال کر پلٹ کر نہ دیکھتے تھے کہ بیج زمین میں گل گیا یا پودا بن کر ابھر آیا۔ یہ لوگ یہ نہیں کرتے ہیں بلکہ بیج کی نگرانی کرتے ہیں۔ اگر پودا نکل آیا تو اس کو مکمل حفاظت سے پنپنے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

اس تحریک میں دعوت کو بڑھانے اور پھیلانے کا سامان بھی ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں

اجتماعات ہیں۔ مرحلہ وار تعلیمات و ہدایات ہیں، تربیتی نشستیں ہیں، اپنی کتابیں ہیں، لٹریچر ہے۔ غرضیکہ اس طرح یہ انفرادی دعوت، علمی دعوت اور صحافتی انداز کی دعوت کی خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے۔

تین ترکیبی عناصر

یہ خوبیاں تو اس کی ظاہری شکل کی تھیں۔ حقیقت کے رخ سے اس میں تین عناصر جمع ہیں جو کئی امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر اس دعوت کے رہنما ان کو یکجا کر کے ایک نیا امتزاج پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ اللہ ان کو اس کوشش میں کامیاب کرے۔

۱۔ ایک عنصر وہ ہے جس کو صوفی نما قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کا اثر دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے (۱) اخوان کی تنظیمی تشکیل بعض لحاظ سے تصوف کے طریقوں سے ملتی جلتی ہے۔ (۲) اپنی روح کے اعتبار سے بھی اس تحریک کے رہنماؤں کی کتابوں اور تقریروں اور مباحثوں میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے جس نے بھی اس تحریک کے بانی حسن البنا شہید کی ڈائری پڑھی ہے اس کو اندازہ ہوگا کہ انکی اٹھان صوفیانہ تھی مگر وہ ایسے طریقے کے مطابق چلتے تھے جس میں دوسرے طریقوں کی غلطیاں نہ تھیں۔

۲۔ سلفی عنصر :- یہ وہ لوگ ہیں جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم کے افکار سے متاثر ہیں اور یہ لوگ پہلے عنصر سے زیادہ نمایاں ہیں۔ آگے بدعت اور صوفیہ کی خلاف سنت باتوں سے یہ لوگ متنفر ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ کتاب و سنت کی رہنمائی سے باہر جو بھی "طریقت" یا "حقیقت" ہے وہ مجذوب کی بڑ ہے یا شیطانی وسوسہ۔

۳۔ عصری تعلیم سے آراستہ عنصر :- یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام اور اسلامی علوم کے علاوہ مغربی علوم سے آراستہ ہیں اور مغرب کی آگ میں جل کر ایمان سے چمکتا ہو کر نکلے ہیں۔ اس عنصر نے بڑے مفید مباحث کا دروازہ کھولا ہے اور اسلام کی افادیت عصری اسلوب میں ثابت کی ہے۔ اسی عنصر کی لکھی کتابوں سے اسلامی ذخیرہ میں قیمتی اضافہ ہوا ہے اور اس لٹریچر سے نوجوان نسل کو بڑا فائدہ ہوا ہے اور اللہ سے ان کی وابستگی جذباتی سے بڑھ کر فکری اور شعوری ہوئی ہے۔

یہ تین عناصر ہیں جو میرے خیال میں اب تک ایک قالب ایک جان ہونے کے منتظر ہیں

میری خواہش ہے کہ اس اجتماع سے مفید نتیجہ نکلے اور تحریک کے رہنما ایسا صحیح امتزاج پیدا کر سکیں کہ نیا عنصر اسلام کے لئے مفید ہو۔ اگر اجزائے ترکیبی میں ذرا سا فرق آگیا تو اس کا خطرہ ہے کہ صوفی عنصر دعوت کے ساتھ وہ غلط صوفیانہ خیالات تحریک کا حصہ بنا دے جن کو صوفیا اپنے مریدوں کے ذہن نشین کراتے آئے ہیں مثلاً شیخ کا ملہم ہونے کا تصور اور اس کی معصومیت سے ملتی جلتی کیفیت جس کے سہارے مرید سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ شیخ کے سامنے اپنے بے حرکت رہے جیسے مردہ غسال کے سامنے رہتا ہے۔ یہ بات اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ہے جو اگرچہ نظم و اطاعت کی بات کہتا ہے مگر عقل و فہم کے ساتھ اور معروف میں، معصیت میں نہیں۔

اسی طرح اگر سلفی عنصر اعتدال سے ہٹ جائے تو پرجوش سلفیت دین فقہ کے مذاہب اربعہ اور جلیل القدر فقہاء کی رہنمائی سے آزادی کو سنت کی پیروی سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ ہر شخص خود اجتہاد کا ملکہ نہیں رکھتا اور کسی مجتہد سے سیکھے بغیر کتاب و سنت سے براہ راست مسئلہ نکالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ نظر اسلامی معاشرے میں کیونکر ابھری۔ بس ایک ہی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ بعض مقلد حضرات کی جہالت کا یہ ردعمل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کی نہ ضرورت ہے نہ اہلیت اور کسی مذہب کی پیروی اس حالت میں بھی ضروری ہے خواہ صحیح حدیث سے مسئلہ کچھ اور معلوم ہوتا ہو۔

میں اس وقت مصر ہی میں تھا جب محب الدین خطیب نے کچھ سرگرم نوجوانوں کو جمع کیا جنہیں جناب محمود شاکر اور جناب عبدالمنعم خلاف اور جناب عبدالسلام ہارون کے ساتھ اور بزرگ جیسے مشہور ادیب احمد تیمور اور عالم خضر حسین بھی شریک تھے اور ان سب نے مل کر عالم عرب کی سب سے پہلی اسلامی جمعیت "جمعیت شبان المسلمین" قائم کی۔

شیخ حسن بنا نے اس جمعیت کے ساتھ مل کر بہت دینی خدمات انجام دیں اور جوانوں میں دینی روح ابھارنے میں لگ گئے مگر جب ان کو اندازہ ہوا کہ یہ جمعیت ان کی ہمت و حوصلہ کا ساتھ نہیں دے پارہی ہے تو وہ اس سے الگ ہو گئے اور اپنے انداز سے کام شروع کیا

جماعت کے نتیجے ہی میں یہ تحریک سامنے آئی۔

تحریک کی مقبولیت و وسعت کے اسباب

اتنے علماء سے آشنائی کے ساتھ جو تحریک ابھری تھی وہ ۳۰ سال سے بھی کم مدت میں اس قدر مقبول کیسے ہو گئی؟ میرے نزدیک اس کے تین اسباب تھے:

۱۔ ایمان کے لئے تڑپ اور تشنگی۔ خاص طور سے ان نوجوان مومن روحوں کے اندر جو اسلام کے نام پر [illegible] سے تھے مگر اسلام کی تعلیمات سے ناآشنا تھے۔ آمریت کی روایت سے نالاں تھے مگر روایتی اسلامی تعلیم نے ان کو مزید الجھا دیا تھا۔ اور ان کی روح اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہو پا رہی تھی۔

۲۔ دعوت کے میدان میں [illegible] نے [illegible] اور [illegible] نے بہت کچھ فضا ہموار کر دی تھی پھر اسلامی پرچے "منار" اور "الفتح" بھی یہ کام کر رہے تھے۔

۳۔ اس دعوت کے سربراہ کی پرکشش شخصیت۔ میری بات لمبی ہوتی جا رہی ہے مگر میں اس بے مثال شخصیت کے کچھ نمایاں پہلو ضرور پیش کروں گا چاہے مختصر ہی سہی۔

اللہ کی توفیق کے ساتھ اس شخصیت میں سات ایسی صفتیں تھیں جو اس بے مثال کامیابی کے پیچھے تھیں۔ چار صفتیں اس کی شخصیت کا حصہ شمار کی جائیں گی اور تین ان کے اخلاق سے متعلق تھیں۔ شخصی صفات یہ تھیں:

(۱) تواضع (۲) سادگی (۳) بے مثال حافظہ (۴) شعلہ بیانی اور بلاغت کلامی۔

تین اخلاقی صفتیں یہ ہیں (۱) علم و دعوت سے لگن (۲) [illegible] (۳) صبر و تحمل۔

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب میں مصر میں ہی تھا۔ میرے پاس ایک شامی صحافی آیا جو ابھی ابھی [illegible] صحافی نے مجھ سے کہا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میری ملاقات شیخ حسن البنا سے کرا دو؟ یاد رہے کہ اس وقت وہ مصر کی سب سے بڑی اور مقبول عام شخصیت شمار ہوتے تھے۔

میں نے اس سے کہا چلو! ابھی چلتے ہیں۔

یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور بے ساختہ کہنے لگا: اس طرح؟ بغیر پیشگی وقت

لئے ہوئے؟ تو میں نے مصری لہجے میں کہا: کیوں کیا حرج؟

تو اس نے کہا: سیاسی پارٹی کے رہنما کا حال تو یہ ہے کہ معمولی سے معمولی پارٹی کا راہنما بھی اس سے ملنے اور گفتگو کے ساتھ دیتا ہے اگر کوئی بار وقت لو تب ملاقات ہو پاتی ہے۔ وہ بھی [illegible] اور اس کے سیکرٹری کی خوشامد الگ کرنی ہوتی ہے۔ کیا شیخ اتنے ہی جلدی ملنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

میں نے اس سے کہا: ابھی دیکھ لیں۔

میں اس کو لے کر شیخ کے پاس ایسے جا پہنچا جیسے کسی عام دوست کے پاس جاتا ہوں۔ شیخ نے بھی ایسے استقبال کیا جیسے برسوں سے شناسا ہوں۔

صحافی نے جب شیخ بنا کی سادگی، بے پناہ علم و معلومات کو دیکھا تو اس کی حیرت اور بڑھتی گئی۔

شیخ بنا کا حافظہ نادر روزگار تھا۔ ان کے پاس ہزاروں [illegible] آتے تھے مگر یہ حال تھا کہ شیخ ہر شخص کا نام [illegible] اس کے مشاغل، گھریلو مسائل سب کے بارے میں جانتے تھے اور ایک ایک چیز کے بارے میں اس سے پوچھتے تھے۔

زبان آوری اور خطابت کی بات آگئی ہے تو میں گواہی دیتا ہوں اور میں تیس سال سے خطابت کے جوہر دکھا رہا ہوں اور میں عرب خطباء اور اہل فصاحت سے پوری طرح واقف ہوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ شیخ جیسا خطیب میں نے نہیں دیکھا۔ عوام سے خطاب کرنے میں شیخ نے جو انداز اپنایا تھا وہ انوکھا تھا اور بے مثل تھا۔ ان کا انداز یہ تھا کہ جیسے وہ کسی سے گفتگو کر رہے ہیں۔ پھر [illegible] زبان میں [illegible] ایک بہتا ہوا دریا تھا جو ہموار انداز میں بہتا چلا جاتا اور گھنٹوں وہ بولتے رہتے تھے مگر مجال نہیں کہ کوئی اکتا کر اٹھ جائے۔

وہ بولتے تھے تو ان کی باتوں میں ایک مومن کا دل دھڑکتا ہوا لگتا تھا اور ان کی روح کی [illegible] اور فکر و تدبر ان کے ہمقدم ہوتے تھے۔ علم کی وسعت سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتی تھی پھر [illegible] شخصیت کا یہ عالم کہ جہاں سخت موقف کی ضرورت ہے وہاں [illegible] کا گزر نہیں اور جہاں نرمی کی [illegible] ہے وہاں ریشم۔ پھر بھی [illegible] کی سخت بات بھی ایسے کہیں گے گویا التماس کر رہے ہوں۔

دنیوی چمک دمک سے ان کی بے رغبتی اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ ان کی نظر نہ کسی

منصب پر تھی نہ کسی مادی کامیابی پر۔ جس طرح سادگی اور سفید پوشی کے ساتھ وہ پہلے روز جلنے جاتے تھے اسی طرح وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کے صبر و تحمل کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلسل سفر کیا کرتے تھے۔ ساری رات ٹرین کے تیسرے درجے کے سفر میں گزر جاتی۔ بیٹھے بیٹھے جتنی نیند ہو جاتی، ہو جاتی۔ صبح کے وقت وہ بستی میں مصروف دعوت ہو جاتے پھر رات کو واپس آکر ٹرین میں سفر ہوتا اور اگلی منزل ہوتی پھر بھی نہ ان پر تھکن کے آثار نہ اکتاہٹ کی جھلک۔

اس انداز کی زندگی کسی منفعت یا خوف سے کچھ دن تو گزاری جا سکتی ہے مگر اس روش کو جزو زندگی بنا لینا، پھر وہ بھی کسی لالچ کے بغیر، یقیناً یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو صرف اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو۔ اس انداز سے شیخ نے دعوت کو پھیلایا اور اسی کا ثمرہ ہے کہ وہ دعوت اسی روح کے ساتھ اب زندہ ہے اور برگ و بار لا رہی ہے۔ ●●

بقیہ: سنہ ۱۹۸۸ء کی کچھ تلخ اور شیریں یادیں:

سنہ ۱۹۸۸ء اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس سال ووٹروں کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔ لیکن دیکھنا ہے کہ اس کا فائدہ آر۔ ایس۔ ایس، شیو سینا اور بجرنگ دل جیسی انسان دشمن تحریکیں اٹھاتی ہیں یا کانگریس۔

سنہ ۱۹۸۸ء میں حکومت ہند بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تنازعہ حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بابری مسجد کی بازیابی کی تحریک جہاد بالسیف نہیں تو کم از کم جہاد باللسان اور جہاد بالقلم ضرور ہے۔ اور اس پر امن تحریک میں جو جانیں گئی ہیں انھیں ہرگز خودکشی نہیں کہا جا سکتا بلکہ انھیں شہادت کا مقام حاصل ہے۔

اسی سال سنہ ۱۹۸۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ عطا دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا اسلامی کردار ختم ہو گیا ہے۔ جو ملت اسلامیہ ہند کے لئے ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ المختصر سنہ ۱۹۸۸ء کچھ تلخ اور کچھ شیریں یادوں کے ساتھ تاریخ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ●●

سنہ ۱۹۸۸ء کی کچھ تلخ و شیریں یادیں

از قاضی زین العابدین، استاذ جامعۃ الفلاح

۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۸۸ء اور یکم جنوری سنہ ۱۹۸۹ء کی درمیانی شب میں رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ میرے ٹیبل پر رکھی چھوٹی الارم گھڑی نے الارم بجا کر سنہ ۱۹۸۸ء کو الوداع کہا اور سنہ ۱۹۸۹ء کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ آج میں ۴۵ ویں منزل طے کر چکا ہوں آج یکم جنوری میری سالگرہ کا دن ہے۔

آج سے ٹھیک ایک سال پیشتر جب یہ گھڑی آئی تھی اس وقت میں کتنا خوش قسمت تھا کہ میرے والدین بقید حیات تھے لیکن سنہ ۱۹۸۸ء کے ماہ رمضان کی ۲۹ تاریخ کو میرے والد کی موت نے مجھے سایۂ پدری سے محروم کر دیا۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ والدہ کا سایہ قائم ہے۔ والد صاحب کی یاد آتے ہی والدہ کے بیوہ ہونے کا خیال دل میں آیا اور میں نے سنہ ۱۹۸۸ء کو نم آنکھوں سے الوداع کہا۔ والد صاحب کی موت نے سنہ ۱۹۸۸ء کو میرے لئے ایک یادگار سال بنا دیا۔

اسی سنہ ۱۹۸۸ء نے مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی ناظم جامعۃ الفلاح کی شریک حیات کو عالم پیری میں ان سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ صدر جامعہ مولانا عبد الطیب صاحب اصلاحی، سابق ناظم جامعہ مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند، اساتذۂ جامعہ اور طلبۂ جامعہ نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

اسی سنہ ۱۹۸۸ء میں ہمیں دنیائے اسلام کے ایک عظیم رہنما جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان کی ہوائی جہاز کے حادثہ میں شہادت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی کی امامت میں جامعۃ الفلاح کی مسجد میں نماز جنازہ غائبانہ اساتذۂ جامعہ اور طلبۂ جامعہ نے ادا کی۔

مذکورہ بالا وہ شخصیتیں تھیں جن کا ہم سے قریبی تعلق تھا۔ ان کے علاوہ ہزاروں انسان

اس دورِ فانی سے ۱۹۸۸ء میں رحلت فرما گئے۔ کچھ اپنی طبعی موت کی وجہ سے، کچھ ہوائی حادثات میں، کچھ ریلوے اور بسوں کے حادثات میں، کچھ زلزلوں میں، اور کئی ایران و عراق کی جنگ کے تباہ کن پہلے تک اور کئی دس ہزار مجاہد افغانستان کی جنگ میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ صرف ہندوستان میں ریلوں، بسوں اور کشتیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۲۵۶ تک پہنچ گئی ہے اور دنیا میں ہوائی جہازوں کے حادثات میں بعد ۱۰۶۰ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے اسلامی دنیا کے دو عظیم ہوائی حادثات ایسے ہوئے ہیں جو ۱۹۸۸ء کیلئے یادگار رہیں گے۔ ۲ جولائی ۱۹۸۸ء کو امریکہ نے خلیج میں ایرانی مسافر بردار ہوائی جہاز کو سمندر میں مار گرایا جس میں ۲۹۸ افراد ہلاک ہوئے۔ اس ہوائی حادثہ نے نہ صرف اسلامی دنیا میں تہلکہ مچا دیا بلکہ دنیا کے کئی ممالک نے امریکہ کی اس ذلیل حرکت کی مذمت کی۔

دوسرا عظیم حادثہ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ہوا جس میں ۳۰ دیگر پاکستانی اعلیٰ ترین افسران اور پاکستان میں متعین امریکی سفیر اور حکومت امریکہ کے ملٹری اتاشی کے ایک اعلیٰ افسر کے علاوہ ضیاء الحق صدر پاکستان ہلاک ہوئے۔ اس طرح ضیاء الحق صاحب شہیدوں میں اپنا نام لکھا گئے ان کی آرزو تھی کہ پاکستان کی فوجی وردی میں انھیں موت نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آرزو پوری کر دی۔ کتنی مبارک ہستی تھی سابق صدر پاکستان ضیاء الحق کی کہ ان کی نماز جنازہ غائبانہ خانہ کعبہ میں ادا کی گئی۔ شہید ضیاء الحق کو ان کی زندگی میں ایک مرتبہ امام خانہ کعبہ نے مغرب کی نماز کی امامت پر اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا تھا اور ضیاء الحق صاحب نے خانہ کعبہ میں ایک وقت کی نماز کی امامت بھی کی تھی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے عوام نے اسلامی نظام برپا کرنے والی اسلامی متحدہ محاذ کو کثیر تعداد میں ووٹ نہ دے کر پیپلز پارٹی کو برسرِ اقتدار لے آئے اور اسلام کو غیروں کی نظروں میں ذلیل کیا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی شہادت کے بعد پاکستان میں ۱۶ اور ۱۹ نومبر ۱۹۸۸ء کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات عمل میں آئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی غلام اسحٰق خان صاحب کو مستقل طور پر صدرِ پاکستان کے جلیل القدر عہدہ پر منتخب کر لیا گیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی فراست سے کام لے کر صاحبزادہ یعقوب علی خان کو خلاف توقع وزارت خارجہ کا قلمدان سپرد کر کے اور پاکستان کی افغان پالیسی برقرار رکھ کر دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ محترمہ جانتی ہیں کہ اسلامی متحدہ محاذ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کریں گی جو اسلامی شریعت سے ٹکراتا ہو بلکہ محترمہ کا خیال تو یہاں تک ہے کہ پاکستان کے موجودہ غیر اسلامی قوانین کو بھی اسلامی قوانین میں تبدیل کیا جائے۔

غیر اسلامی ماحول کی پروردہ اور اشتراکی ذہن رکھنے والی خاتون جب اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں تو انھیں اپنے ملک کی سالمیت اور افغان مجاہدین کی پرزور حمایت اور اسلامی قوانین کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔

لیکن محترمہ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ سرزد ہوگئی کہ وزیر اعظم بننے کے بعد انھوں نے اپنی پہلی نشری تقریر کے دوران قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر کے ساتھ اپنے والد سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی تصویر آویزاں کر کے مملکت پاکستان کی عدالت عالیہ کی توہین کی ہے۔ مجرم کو ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزا سنائی تھی جس کو پاکستان کے سپریم کورٹ نے بھی بحال رکھا تھا لہٰذا ایک مجرم کی تصویر وزیر اعظم ہاؤس یا پاکستان کی قومی عمارتوں کے ہالوں میں نصب کرنا خلاف مصلحت تھا۔

اسی طرح اپنے والد سے والہانہ محبت رکھنے کی وجہ سے پاکستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے نام کے ساتھ شہید کی مقدس اصطلاح استعمال کرنا بھی توہین عدالت اور پاکستان کے قانون کے ساتھ کھلی بغاوت کے مترادف ہے۔ لہٰذا نا تجربہ کار اور دنیا کی سب سے کم عمر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو جذبات پرستی کے بجائے عقل و ہوش سے کام لینا ہوگا۔

محترمہ کو یہ جاننا چاہئے کہ پاکستان کے صرف ۳۹ فیصد ووٹروں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا ہے جبکہ ۶۱ فیصد ووٹ ان کے خلاف ڈالے گئے ہیں۔ مسٹر بھٹو کی شخصیت پاکستان کی قومی سطح پر بہت ہی متنازعہ شخصیت رہی ہے۔ بنگلہ دیش کے علیحدہ مملکت بننے اور پاکستان سے علیحدہ ہونے میں بھٹو کا رول نمایاں رہا ہے جسے اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ لہٰذا کم عمر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو چاہئے کہ اپنے والد کے ساتھ اپنی محبت کو اپنے دل ہی میں رہنے دیں محبت کے بے جا مظاہرہ سے پاکستان کی قومی سطح کی یکجہتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

شہید ضیاء الحق کی وفات کے بعد پاکستان کی سیاست کا ایک زبردست المیہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے تمام علمائے کرام نے اسلامی متحدہ محاذ میں شرکت نہ کر کے پیپلز پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے میں بالواسطہ مدد کی ہے۔ جمعیت العلمائے اسلام، علمائے اہلحدیث، دیوبندی علمائے کرام اور بریلوی مکتبِ فکر کے علماء نے واحد اسلامی ذہن رکھنے والی اسلامی متحدہ محاذ کا ساتھ نہ دے کر سیکولر ذہن رکھنے والی سیاسی جماعتوں کی ہمت افزائی کی ہے۔

انتخابات کے بعد بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں اگر جمعیت العلمائے اسلام، اسلامی متحدہ محاذ کا ساتھ دیتی تو بلوچستان میں ایک مستحکم وزارت بنتی، تعجب ہے کہ پیپلز پارٹی نے بلوچستان میں اسلامی اتحاد کا ساتھ دیا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف پندرہ دن کے اندر ہی بلوچستان کی اسمبلی کو برخاست کر دیا گیا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کی نوزائیدہ جمہوریت کو علمائے کرام کی سیاست سے ناواقفیت اور آپسی بغض و عناد کی وجہ سے یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔

بہتر ہوگا کہ پاکستان کی تمام دینی و اسلامی جماعتیں اور مختلف مکاتب کے علمائے کرام آئندہ انتخابات کے لئے ایسی حکمتِ عملی اپنا سکیں کہ وہ مملکتِ پاکستان کی دو عظیم سیاسی جماعتوں یعنی اسلامی متحدہ محاذ اور پیپلز پارٹی میں سے اپنی پسند کی کسی ایک سیاسی پارٹی کا ساتھ دیں اور اس سیاسی پارٹی میں باقاعدہ شامل ہو کر اس سیاسی پارٹی کو اپنے اسلامی طرزِ فکر سے متاثر کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ دونوں عظیم سیاسی جماعتیں اسلامی ذہن اور کردار کی حامل بن سکیں گی۔ نیز پاکستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام کو اپنی بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرنے کا موقع بھی مل سکے گا۔

۱۶ اور ۱۹ نومبر ۱۹۸۸ء کے پاکستان کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ بعض مقامات پر یہ انتظام کیا گیا کہ جماعت اسلامی کے لوگ زیادہ نمایاں نہ ہوں ورنہ اسلامی متحدہ محاذ میں شریک مسلم لیگ کے نمائندوں کو ووٹ نہیں ملیں گے۔ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ محنت اور بھاگ دوڑ کریں بیچارے جماعت اسلامی کے ارکان لیکن چونکہ یہ نعوذ باللہ "گستاخِ رسولؐ" وہابی اور یزیدی فقیروں کے لشکر کے طور پر مشہور تھے لہٰذا ان کی پذیرائی مشکوک رہی اور انہیں صفِ اول میں مقام نہ مل سکا۔

بات طول کھینچ رہی ہے لیکن یہ عرض کرتے ہوئے چلوں کہ شہید ضیاء الحق کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیرِ اعظم منتخب ہوئی ہیں۔ مسلم ممالک کی یہ پہلی خاتون ہیں جو سربراہِ مملکت ہوئی ہیں۔ پاکستان کے تمام ووٹروں کو یہ معلوم تھا کہ پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کا مطلب محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیرِ اعظم کے عہدہ پر فائز کرنا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر بنے ہوئے پاکستان کی تقریباً ۹۵ فیصد آبادی کا دین اسلام سے واسطہ محض نام کا ہے۔ پاکستان کے مسلم عوام کی بہ نسبت ہندوستان کے مسلم عوام کو اسلامی متحدہ محاذ کی حکومت نہ بننے کا افسوس ہے۔ روس، امریکہ، اسرائیل، ہندوستان، انگلستان اور دنیا کے دیگر سیکولر ذہن رکھنے والی حکومتوں نے پیپلز پارٹی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی کامیابی پر خوشیاں منائی ہیں کیونکہ انہیں اسلامی انقلاب نے خوف زدہ کر رکھا ہے وہ مسلم عوام سے ہی سیکولر جمہوریت کے نام پر اسلام دشمنی کا کام لینا چاہتی ہیں۔ یہ ہمارے لئے لمحۂ فکر ہے۔

۱۹۸۸ء رخصت ہوتے ہوتے کچھ شیریں یادیں بھی ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے۔ ۲۹، ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اسلام آباد پاکستان میں وزیرِ اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر کی زیرِ صدارت جنوبی ایشیا کے سات ممالک کے سربراہوں کی علاقائی سارک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسلام آباد کا ماحول بدل چکا تھا۔ صدر راج کی جگہ جمہوریت نے لے لی تھی۔

سارک تنظیم کے دو بادشاہوں، تین صدروں اور دو وزرائے اعظموں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ ان مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہوں نے اس کانفرنس میں عہد کیا کہ وہ ان ممالک کی خود مختاری، قومی آزادی اور علاقائی سالمیت کا احترام کریں گے۔ ایک دوسرے کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کریں گے اور ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیں گے اور تمام آپسی تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ نیز ان سربراہانِ مملکت و حکومت نے امریکہ اور روس کے درمیان ۱۹۸۸ء کے دوران خوشگوار تعلقات پیدا ہونے پر طمانیت ظاہر کیا۔

ان سربراہوں نے اس عزم کو دُہرایا کہ ان کے ممالک تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور تاریخی رشتوں میں منسلک ہیں اور وہ بے بہا قدرتی ذرائع کے مالک ہیں لہٰذا انہیں ان قدرتی ذرائع کو اس علاقے کے عوام کی بہبودی کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ یہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کیونکہ ہندوستان اس تنظیم کا طاقتور ترین ملک ہے۔ اُسے تنظیم کے کمزور اور پسماندہ ممالک کا استحصال نہیں کرنا چاہیے۔

سارک کانفرنس کے موقع پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تین معاہدوں پر دستخط ہو گئے۔ اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک نیا تاریخی موڑ آیا ہے اس لئے ہم سنہ ۱۹۸۹ء کو ایک تاریخ ساز سال کہہ سکتے ہیں۔

یہ کیا حقیقت ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے" (HISTORY REPEATS ITSELF) شملہ معاہدہ پر دستخط سنہ ۱۹۷۲ء میں بھٹو اور اندرا گاندھی نے ثبت کئے تھے اور ۱۶ برسوں کے بعد ان دونوں عظیم رہنماؤں کے بیٹے اور بیٹی راجیو گاندھی اور محترمہ بے نظیر نے ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۸۸ء کو تین معاہدوں پر دستخط کئے ہیں۔ اس لئے محترمہ بے نظیر بھٹو ہمیشہ "شملہ معاہدہ" کے گُن گاتی رہتی ہیں تاکہ ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو ابھارا جائے حالانکہ محترمہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ سنہ ۱۹۸۴ء ہی میں "سیاچین گلیشیر" پر پاکستانی قبضہ کو بے دخل کرکے ہندوستان نے اس پر اپنا ناجائز قبضہ کر رکھا ہے جو شملہ معاہدہ کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔

۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۸۸ء سارک کانفرنس کا ایک آخری منظر یہ تصویر بھی پیش کرتا ہے کہ جس عمارت میں بیٹھ کر محترمہ بے نظیر بھٹو اور محترم جناب راجیو گاندھی تین معاہدوں پر دستخط کر رہے تھے اس عمارت کے باہر آزاد کشمیر کے جیالے مظاہرہ کر رہے تھے اور پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے کہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر یعنی سری نگر کی وادی کے درمیان آمد و رفت کی قدیم سڑک "اڑی" کھول دی جائے تاکہ کشمیر کے بھائی آپس میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ یہ ہے سارک کے سربراہوں محترمہ بے نظیر اور راجیو گاندھی کا طرز عمل کہ کشمیر کے عوام کے لئے راستہ نہیں کھولا جا سکتا لیکن دنیا کے عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے خوشنما الفاظ میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ سارک تنظیم کے ممبران پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے لئے ویزا (VISA) کے بغیر ان سات ممالک میں آنے جانے کی کھلی اجازت دے دی گئی ہے۔ نیز آگے چل کر یہ مراعات اخبار نویسوں کو بھی دی جائیں گی اور انھیں بھی ویزا حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

بہرحال ہندوستان کے ہم مسلمانوں کو حکومت پاکستان کی تبدیلی سے اطمینان کا سانس لینا

نصیب ہوگا کیونکہ جب تک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے حکومت ہند اور بھارت کے متعصب لیڈروں کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی بڑھتی گئی اور انہیں گناہوں کی سزا کے مستحق قرار دیئے گئے۔ الغرض سنہ ۱۹۸۸ء جاتے جاتے ہمیں جینے کا کچھ حسین سہارا دے کر گزر گیا۔

آیئے دنیا کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالتے چلیں جن کی وجہ سے سنہ ۱۹۸۸ء ایک یادگار سال کے لحاظ سے یاد رکھا جائے گا۔

ایران اور عراق کی آٹھ سالہ جنگ کا بالآخر خاتمہ ہو گیا۔ افغانستان سے روسی افواج کا انخلاء بھی ۱۵ فروری سنہ ۱۹۸۹ء تک عمل میں آنے کی توقع تھی لیکن پاکستان کے مرد آہن ضیاء الحق کی ناگہانی شہادت نے واقعات کا رخ بدل دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ روس ابھی مزید چند ماہ اپنی فوجیں واپس بلائے۔ جارج بش امریکہ کے نئے صدر منتخب ہوئے ہیں جنھوں نے افغانستان کے مجاہدین اور حکومت پاکستان کی نئی حکومت کی پوری طرح مدد جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

امریکہ بالآخر پی۔ ایل۔ او کے سامنے جھک رہا ہے۔ یاسر عرفات نے بالآخر اسرائیل کو تسلیم کر لیا اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ دنیا کے ۸۲ ممالک نے آزاد فلسطینی حکومت تسلیم کر لیا ہے۔

آخر میں ہندوستان کے چند اہم واقعات پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کرنا بھی ضروری ہے "ورنہ" سنہ ۱۹۸۸ء کی روداد مکمل نہ ہو سکے گی۔ سنہ ۱۹۸۸ء عنقریب ۱۹ ریاستوں کا کانگریس کے لئے پریشانیوں کا سال رہا ہے۔ وی۔ پی۔ سنگھ کی الہ آباد کے الیکشن کی کامیابی نے حزب اختلاف کی امیدیں بڑھا دیں۔ قومی محاذ نے چند علاقائی اور دیگر پارٹیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔ جنتا دل بھی قائم کیا گیا لیکن بہوگنا اور اسی قبیل کے چند لیڈروں کی خود غرضی سے اپوزیشن گروپ کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔

بوفورس کا معاملہ حکومت ہند کے لئے اس سال بھی درد سر بنا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب کے باقی تیس صفحات منظر عام پر آ گئے اور یہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستان کے قیام کے لئے پنڈت نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل ذمہ دار تھے۔

باقی صفحہ ۳۰ پر

پہلی قسط

قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ؟

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی، استاذ جامعۃ الفلاح

ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور کے اگست ۱۹۸۸ء کے شمارے میں جناب میاں محمد شوکت صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اپریل و مئی ۱۹۸۸ء کے شماروں میں "قرآن میں اصحاب فیل کا واقعہ" کے عنوان سے ادارہ معارف اسلامی منصورہ کے جناب محمد رفیق چودھری صاحب کا جو مضمون چھپا ہے، اس میں غیر ضروری جوش و خروش اور غیظ و غضب کے زیر اثر اختلاف و تنقید کے حدود و آداب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اور اس میں حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں وہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ انہیں مولانا علیہ الرحمۃ کی رائے سے اختلاف کا حق تو حاصل تھا لیکن اس اختلاف میں ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔

یہ مراسلہ اس مجلے کے تقریباً ساڑھے چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے مگر مراسلہ نگار نے اس میں کہیں سنجیدگی و متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے برعکس بڑی خوبصورتی سے مضمون کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے بس یہ شکایت کی ہے کہ مولانا علیہ الرحمۃ کو محض اتنی سی بات پر متجددین کی فہرست میں شامل کرنا کسی طرح جائز نہیں تھا۔

اس مراسلے کے ساتھ اس کا جواب بھی اسی شمارے میں چودھری صاحب کے ہی قلم سے شائع ہوگیا تھا جو درج ذیل ہے:

"میں عرض کروں گا کہ وہ تمام لوگ جو درج ذیل نظریات رکھتے ہیں، میرے نزدیک متجددین اور منکرین حدیث میں شامل ہیں:

۱۔ جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ جو احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے اجتماعی طور پر مسلّمہ اصولوں کو چھوڑ کر اپنے کچھ خود ساختہ اصول رکھتے ہیں اور جن کے ذریعہ وہ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے کا اعتقاداً اور

عملاً انکار کرتے ہیں۔

۳۔ جو اجماع امت کے شرعاً حجت ہونے کے منکر ہیں۔

۴۔ جو قرآن مجید میں مذکورہ معجزات انبیاء کی اس طرح تاویل و توجیہ کرتے ہیں کہ ان کا اعجازی پہلو بالکل ختم ہو جاتا ہے اور وہ عام معمول کے طبعی واقعات یا پھر اتفاقات نما معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ جو اسلامی تعلیمات و احکامات کی مسلّمہ تعبیرات سے ہٹ کر ان کی ایسی تعبیریں اور تاویلیں اختیار کرتے ہیں جن کے بعد انہیں جدید عقلیت پسند ذہن کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

میں یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ اور علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ واقعۂ اصحاب فیل کی تاویل نو کے اصل موجد اور اس کے پیروکاروں کو میں نے درج بالا گمراہ کن نظریات کا حامل پایا ہے، اس لیے میں ان لوگوں کو بھی متجددین اور منکرین حدیث کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنے مضمون میں ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا تھا۔"

* * * * * * *

یہ ہے وہ وضاحت جو اس مراسلے کے جواب میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئی ہے۔ اس وضاحت سے معلوم نہیں مراسلہ نگار کی تشفی ہوئی یا نہیں۔ البتہ مدیر مجلہ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کے نام جو مراسلہ بھیجا گیا تھا اس کا جواب شائع ہو گیا۔ چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے ان کلمات کے ساتھ یہ جواب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

"میں نے مناسب یہی سمجھا کہ جس مضمون پر اعتراض ہے اس کے لکھنے والے دوست ہی خود جواب دیں۔"

جناب نعیم صدیقی صاحب ہمارے قابل احترام بزرگ ہیں۔ تحریک اسلامی کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ وہ مدرسۂ مودودی کے مایۂ ناز فرزندوں میں سے ہیں۔ علم و فضل اور اسلامی غیرت و حمیت کے لحاظ سے وہ ہمارے درمیان معروف ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں بجا طور پر ان سے امید تھی کہ وہ اس موقع پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہی کی شخصیت ان کے لیے نئی نہیں ہے خود مولانا مودودی کے گہربار اور حقیقت نگار قلم سے ترجمان القرآن میں بارہا ان کو خراج عقیدت

پیش کیا جاتا رہا ہے۔

ہمیں حیرت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ایسا غیر معیاری اور غیر علمی مضمون ترجمان القرآن میں شائع کیسے ہو گیا۔ اور اگر غفلت سے شائع ہو گیا تو شوکت صاحب کے توجہ دلانے پر بھی اس غلطی کی تلافی کیوں نہیں کی گئی؟

اور اگر کسی وجہ سے مراسلہ کا جواب چودھری بہادر سے ہی لکھوانے کا فیصلہ کیا گیا تو کم از کم ان کا جواب یا اسباب سامنے آجانے کے بعد بحیثیت ایڈیٹر کے خود اپنی ذمہ داری کیوں نہیں محسوس کی گئی؟

چودھری بہادر کا اصل مضمون "قرآن میں اصحاب فیل کا واقعہ" اپنے اندر کتنا وزن اور کتنی معقولیت رکھتا ہے اس کا جائزہ تو ہم آئندہ لیں گے۔ سر دست ہم انہی نقاط تک اپنی یہ گفتگو محدود رکھنی چاہتے ہیں جن کی طرف آنجناب نے اپنے تازہ جواب میں اشارہ فرمایا ہے اور جن کی بنیاد پر ترجمان القرآن نے علامہ حمید الدین فراہیؒ اور ان کے خوشہ چینوں کے خلاف تجدد اور انکار حدیث کا فتویٰ صادر کرنا ضروری سمجھا ہے۔

پہلا واقعہ

امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر آنجناب نے جو پہلی تہمت عائد کی ہے وہ یہ ہے:

"جو سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی طرح "مستقل بالذات ماخذ قانون" تسلیم نہیں کرتے۔"

یہاں چودھری بہادر سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ یہ کسوٹی جو آپ نے مقرر فرمائی ہے اس کے لئے خود آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ سنت کے مستقل بالذات ماخذ قانون ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا قرآن و سنت دو متوازی خطوط ہیں جو کہیں ایک دوسرے سے ملتے نہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی مستقل حیثیت ہے؟ کیا یہ دو الگ الگ شریعتیں ہیں جن کے ہم پابند کئے گئے ہیں؟

ہم نے جہاں تک پڑھا اور سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں قرآن کے مبلغ اور اس کے ترجمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ اس طرح جو کچھ آپ نے کیا ہے یا فرمایا ہے وہ قرآن ہی کی تشریح یا اسی کی عملی تطبیق تھی۔

صحابہ و تابعین کا نقطۂ نظر

اسی بات کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہایت مختصر اور بلیغ انداز میں یوں فرمایا ہے: كان

خلقه القرآن" آپ کا اخلاق، آپ کا کردار، آپ کا ایک ایک بول اور ایک ایک ادا قرآن پاک ہی کی آئینہ دار تھی۔"

اسی بات کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اور زیادہ واضح لفظوں میں یوں فرمایا:

اذا حدثتكم بحديث انبأتكم بتصديقه من كتاب الله.

میں کوئی بھی حدیث تم سے بیان کروں، قرآن پاک میں اس کی تائید تم کو دکھا سکتا ہوں۔

اسی سے ملتا جلتا حضرت سعید بن جبیر کا مشہور قول ہے:

ما بلغني حديث على وجهه الا وجدت مصداقه في كتاب الله تعالى

مجھ تک جب بھی کوئی صحیح حدیث پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں مجھے اس کی تائید مل گئی ہے۔

امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر

اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے:

جميع ما تقوله الائمة شرح للسنة وجميع السنة شرح القرآن

ائمہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سنت کی شرح ہے اور پوری سنت قرآن کی شرح ہے۔

ایک اور موقع پر وہ فرماتے ہیں:

كل ما حكم به رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو مما فهمه من القرآن لقوله صلى الله عليه وسلم اني لا احل الا ما احل الله في كتابه ولا احرم الا ما حرم الله في كتابه۔ [1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلے کئے ہیں وہ قرآن سے مستنبط کئے ہوئے ہیں، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: میں اس چیز کو حلال ٹھہراتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا ہے اور وہی چیزیں حرام قرار دیتا ہوں جنھیں اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: قواعد التحدیث، از علامہ محمد جمال الدین قاسمی ص ۵۹ تحقیق و تعلیق محمد بہجۃ البیطار۔ دار الاحیاء الکتب العربیۃ۔ الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۸۰ھ

خلیفۂ ثانی کا فیصلہ کن ارشاد

صحیح بخاری کی مشہور روایت ہے۔ اس سے بھی ہمیں اس سلسلے میں واضح رہنمائی ملتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ قال: لما حضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی البیت رجال فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ھلموا اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ فقال بعضھم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد غلبہ الوجع وعندکم القرآن۔ حسبنا کتاب اللہ۔ [١]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا اور اس وقت گھر میں بہت سے لوگ تھے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دیتا ہوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے۔ ان میں سے ایک نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہی ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

دوسری روایتوں میں یہ صراحت ہے کہ یہ کہنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ [٢]

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سنت قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون ہے تو اس موقع پر حضرت عمر فاروق نے قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اور بس اتنا ہی کہنے پر کیسے اکتفا کر لیا کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے؟

پھر اگر ان کی یہ بات ادھوری رہ گئی تھی تو دوسرے اجلہ صحابہ نے اس کی تکمیل یا تصحیح کیوں نہیں فرمائی؟ پھر خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں صحابہ کرام سے جو آخری خطاب فرمایا تھا اس میں یہ الفاظ بھی تھے: انی لم احل الا ما احل القرآن ولم احرم الا ما حرم القرآن۔ [٣]

"میں نے بس انہی چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے جن کو قرآن نے حلال ٹھہرایا ہے اور بس انہی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔"

---

[١] باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔ [٢] ملاحظہ ہو امتاع الاسماع للمقریزی ۱/۵۴۶ طبع محمود محمد شاکر الشئون الدینیہ۔ قطر۔

[٣] سیرت ابن ہشام ۴/۶۵۴ تحقیق: مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شلبی۔

امام شاطبی کی توضیح

امام شاطبی اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سنت اپنے معنی و مفہوم میں قرآن کے تابع ہے کہیں یہ اس کے اجمال کی تفصیل ہوتی ہے، کہیں اس کے مشکل مقام کی توضیح ہوتی ہے اور کہیں اس میں کوئی بات مختصر ہوتی ہے تو یہ اسے شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ سنت اصل میں قرآن کی ہی تبیین ہے۔ یہی بات ہے جو اس فرمان الٰہی سے معلوم ہوتی ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔

اور ہم نے تمہاری طرف یہ ذکر اتارا ہے تاکہ لوگوں کے لئے واضح کر دو اس چیز کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

چنانچہ تم سنت میں کوئی ایسی بات نہیں پاؤ گے جس کی قرآن نے نشاندہی نہ کر دی ہو، اجمال کے ساتھ یا تفصیل کے ساتھ۔

پھر ہر وہ چیز جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ قرآن ہی شریعت کی اصل اور اس کا سرچشمہ ہے، وہ اس مسئلہ زیر بحث کی بھی دلیل بنے گی۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وانک لعلی خلق عظیم۔" حضرت عائشہؓ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ آپ کا خلق قرآن تھا۔ آپ کے خلق کے سلسلے میں انہوں نے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے جو کچھ کہا یا کیا یا جس قول و فعل کو آپ نے سند جواز عطا کیا ان سب کا مرجع و ماخذ قرآن تھا۔ اس لئے کہ خلق میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو "تبیانا لکل شیئ" فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر چیز کے لئے رہنمائی موجود ہے۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ اجمالی طور پر سنت بھی اس میں داخل ہو، کیونکہ امر و نہی قرآن کی اولین چیز ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ما فرطنا فی الکتاب من شیئ" "ہم نے قرآن میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔" اسی طرح خدا کا ارشاد ہے: "الیوم اکملت لکم دینکم" مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن اتار کر آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اس طرح خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں

جو کچھ ہے سنت ہی کا بیان ہے اور یہی مطلب ہوتا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سنت قرآن کے تابع ہے۔" [1]

اس ساری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ سنت کے قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات مآخذ قانون ہونے کا نظریہ ایک باطل نظریہ ہے، جسے حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ خالص ایک جذباتی نعرہ ہے جس کے پیچھے دلیل و برہان کی کوئی قوت نہیں۔

دوسری دفعہ

دوسری دفعہ جو استاذ امام اور ان کے تلامذہ پر عائد کی گئی ہے، یہ ہے:

"جو احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے اجتماعی طور پر مسلمہ اصولوں کو چھوڑ کر اپنے کچھ خود ساختہ اصول رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ وہ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے کا اتفاقاً اور عمداً انکار کرتے ہیں:"

ہمیں نہیں معلوم کہ احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے کون سے مسلمہ اصول ہیں جن کو امام فراہی نے چھوڑا ہے، اور کون سے وہ خود ساختہ اصول ہیں جن پر قبلہ چودھری صاحب کو اعتراض ہے۔

چودھری بہادر کے الفاظ سے ہمیں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں ان کی معلومات کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ انھیں یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ روایات کو جانچنے پرکھنے کے وہ کیا اصول ہیں جو علمائے اصول نے وضع کیے ہیں۔ وہ بس یہ جانتے ہیں کہ کوئی روایت اگر کسی مجموعہ احادیث و فن میں درج ہو گئی ہے اور علمائے جرح و تعدیل نے سنداً اس کو رد نہیں کیا ہے تو محض یہ بات اس کی صحت کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ان اصولوں کا بھی مختصراً یہاں تذکرہ کر دیا جائے جو اہل فن کے زیر نظر رہے ہیں اور ائمہ حدیث جن کی ہمیشہ رعایت کرتے رہے ہیں۔

قبول حدیث کی شرطیں

امام ابن کثیرؒ جو ایک بلند پایہ محدث و مؤرخ اور ایک عظیم المرتبت مفسر تھے، کسی روایت کو موضوع قرار دینے کے لیے ذیل امور میں سے کسی ایک بات کا ہونا کافی سمجھتے ہیں:

(۱) اقرار واضعه على نفسه قالاً او حالاً (۲) ركاكة الفاظه (۳) فساد معناه (۴) مجازفة فاحشة (۵) مخالفة لما ثبت في الكتاب والسنة الصحيحة۔

---

[1] الموافقات، امام شاطبی ۴/۹

(۱) خود حدیث کا گھڑنے والا اس بات کا اعتراف کرے، چاہے زبان قال سے یا زبان حال سے۔ (۲) روایت کے الفاظ پھسپھسے ہوں۔ (۳) روایت کا مضمون فاسد ہو (۴) بالکل اوٹ پٹانگ بات معلوم ہوتی ہو (۵) قرآن یا حدیث صحیح کے خلاف بات ہو۔ [1]

امام سیوطی نے اپنی کتاب (تدریب الراوی) میں اس مسئلے میں امام ابن جوزی کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما احسن قول القائل: اذا رأيت الحديث يباين المعقول او يخالف المنقول او يناقض الاصول فاعلم انه موضوع۔ [2]

کسی کہنے والے نے کتنی اچھی بات کہی ہے، جب تم کسی حدیث کو دیکھو کہ وہ عقل سے بعید ہے یا دوسری احادیث کے خلاف ہے یا دین کے اصول سے ٹکراتی ہے، تو سمجھ جاؤ کہ وہ گھڑی ہوئی ہے۔

خطیب بغدادی نے ابوبکر بن الطیب کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اگر کوئی روایت کسی نہایت عظیم اور مہتم بالشان معاملہ یا واقعہ کی خبر دیتی ہے اور وہ معاملہ یا واقعہ ایسا ہے کہ اس کے راوی بہت سے ہونے چاہئیں لیکن روایت صرف ایک ہی راوی کے واسطہ سے آئی ہے تو یہ بات بھی اس روایت کو موضوع قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

اگر کسی چھوٹی سی بات پر بڑی سخت وعید آئی ہے یا کسی حقیر سے کام پر بہت بڑے اجر کا وعدہ ہے تو یہ چیز بھی اس روایت کے موضوع ہونے کی علامت ہوگی۔ [3]

اگر کوئی خبر واحد کوئی ایسی اطلاع دیتی ہے جس سے مطلع ہونا سب کے لیے ضروری ہے، مثلاً کسی روایت سے یہ معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی تھی، تو اس طرح کی روایت واجب الرد ہوگی، وہ کبھی قبول نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ خبر واحد علم یقین کا فائدہ نہیں دیتی اور اس لیے بھی کہ اس طرح

---

[1] اختصار علوم الحدیث للامام ابن کثیر مع شرح الباعث الحثیث للاستاذ احمد محمد شاکر۔ ص ۸۱

[2] تدریب الراوی للامام السیوطی۔ ص ۲۷۷

[3] ملاحظہ ہو الباعث الحثیث: ۸۳

بات فوراً پہچان جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے نقل ہوتی چلی جاتی ہیں تو اب اگر کوئی ایک ہی راوی اس طرح کی بات نقل کرے تو وہ جھوٹا سمجھا جائے گا۔ [1]

ربیع بن خثیم کہتے ہیں:

ان للحدیث ضوءاً کضوء النهار تعرفه، وظلمة کظلمة اللیل تنکره۔ [2]

حدیث کی ایسی روشنی ہوتی ہے جیسے دن کی روشنی، تم اسے بآسانی پہچان لوگے اور ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی کہ تمکو اس سے وحشت ہوگی۔

امام ابن جوزی فرماتے ہیں:

الحدیث المنکر یقشعر له جلد الطالب للعلم، وینفر منه قلبه فی الغالب۔ [3]

غلط حدیث سے عموماً طالب علم کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس سے اس کے دل کو وحشت ہوتی ہے۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

خبر الواحد اذا تکاملت شروط صحته هل یجب عرضه علی الکتاب؟ قال الشافعی رضی الله عنه: لا یجب لانه لا تتکامل شروطه الا وهو غیر مخالف للکتاب۔ وعند عیسیٰ ابن ابان: یجب عرضه علیه۔ لقوله صلی الله علیه وسلم (اذا روی لکم

خبر واحد میں اگر صحت کی تمام شرطیں پائی جارہی ہیں تو کیا اس صورت میں بھی قرآن کی کسوٹی پر اسے پرکھنا ضروری ہوگا؟ شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں وہ تمام شرطیں پائی ہی نہیں جاسکتیں جب تک کہ وہ قرآن کے موافق نہ ہو۔ اور عیسیٰ بن ابان [4] رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہوگا کیونکہ آپ نے

باقی صفحہ ۵۴ پر

---

[1] التمہید فی اصول الفقہ ۳/۱۵۱، (علامہ ابو الخطاب الکلوذانی الحنبلی ۴۳۲ھ — ۵۱۰ھ)

[2] الباعث الحثیث: ۸۲۔ [3] ایضاً: ۸۳

[4] عیسیٰ بن ابان ایک بلند پایہ محدث اور ایک بالغ نظر فقیہ تھے۔ کئی سال تک یہ بصرہ کے قاضی رہے اور ۲۲۰ھ میں بصرہ ہی میں وفات پائی۔ کتاب اثبات القیاس، کتاب الحجج اور الجامع جیسی بلند پایہ علمی کتابوں کے مؤلف تھے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبد الرحمن رافت پاشا .... ترجمانی: ابو جاوید

غفار کا قبیلہ ودان کی وادی میں آباد تھا جو مکہ کو باہر کی دنیا سے جوڑتی تھی۔ قبیلہ غفار کے گذر بسر کا دارومدار ان تھوڑے سے عشروں اور عطیات پر تھا جو شام کی طرف آنے جانے والے قریش کے تجارتی قافلوں سے انھیں حاصل ہوتی تھیں۔ بارہا ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر یہ قافلے ان کی مرضی کے مطابق انھیں مال و دولت نہ دیتے تو یہ انھیں بے دریغ لوٹ لیا کرتے تھے۔

جُندُب بن جُنادہ جو عام طور سے اپنی کنیت ابوذر کے ساتھ مشہور ہیں، اسی قبیلے کے ایک فرد تھے مگر وہ اپنی شجاعت و دلیری، حلم و دانشمندی اور دور اندیشی و بالغ نظری کی بنا پر ان میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ اپنے ابنائے قبیلہ میں اس لحاظ سے بھی امتیازی خصوصیت کے مالک تھے کہ وہ ان بتوں سے سخت بیزار اور دل برداشتہ تھے جن کو ان کے قبیلے نے خدا کے مقابلے میں اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ عرب میں پایا جانے والا دینی بگاڑ اور فرسودہ عقیدہ انھیں سخت ناگوار تھا۔ وہ کسی نئے نبی کے منتظر تھے جو لوگوں کی عقل و ذہن کو مطمئن کردے اور انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔

ابوذر کے پاس، جبکہ وہ اپنی بستی میں تھے، مکہ میں ظاہر ہونے والے نئے نبی کی خبریں پہنچیں تو انھوں نے اپنے بھائی انیس کو بلا کر کہا:

”پیارے بھائی! تم مکے چلے جاؤ اور اس شخص کے حالات معلوم کرو جو اس بات کا دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اس سے اس کی باتیں سنو اور یہ ساری معلومات میرے پاس لاؤ۔“

انیس مکہ پہنچے۔ وہاں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرکے ان کی باتیں سنیں اور اپنے قبیلے میں واپس آگئے۔ ابوذر، جو بڑی بے چینی کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، ان سے ملے اور بڑے اشتیاق سے نئے نبی کے حالات دریافت کئے

انیس نے انھیں بتایا:

"مکہ میں ایک ایسے شخص سے ملا جو مکارمِ اخلاق کی دعوت دیتا ہے اور ایسا کلام سناتا ہے جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔"

"لوگ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟" ابوذر نے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے، کاہن ہے اور شاعر ہے۔" انیس نے جواب دیا۔

"واللہ تمھاری باتوں سے میرا اطمینان نہیں ہوا، نہ میری وہ ضرورت پوری ہوئی جس کے لئے میں نے تم کو بھیجا تھا۔ میں خود وہاں جا کر براہِ راست اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری غیر موجودگی میں میرے اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہو؟" ابوذر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، میں یہ ذمہ داری بخوشی ادا کروں گا۔ آپ جائیے مگر مکہ والوں سے محتاط رہیے گا۔" انیس نے جواب دیا۔

ابوذر نے زادِ راہ کا انتظام کیا۔ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پانی کا برتن لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے مکہ کی سمت چل پڑے۔ وہ مکہ پہنچ گئے۔ مگر دل ہی دل میں ڈر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ قریش اپنے معبودوں کی حمایت میں سخت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہر اس شخص کو سخت اور عبرتناک سزائیں دیتے ہیں جو محمدؐ کے اتباع کا خیال بھی اپنے دل میں لاتا ہے۔ اس لئے انھوں نے کسی سے ان کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ جس شخص سے وہ پوچھیں گے وہ ان کے ماننے والوں میں سے ہوگا یا مخالفین میں سے۔

رات کو وہ مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ اتفاقاً ادھر سے حضرت علیؓ کا گزر ہوا تو ایک غریب الوطن پردیسی سمجھ کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ رات انھوں نے ان کے گھر گزاری اور صبح کو اپنی چھاگل اور سامانوں کا تھیلا اٹھا کر مسجد واپس آ گئے۔ اس دوران ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ابوذر نے دوسرا دن بھی اسی طرح گزار دیا اور انھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ رات کو وہ پھر

مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ حضرت علیؓ کا ادھر سے گزر ہوا تو انھوں نے ان سے کہا "کیا تمھیں ابھی تک اپنی منزل نہیں معلوم ہوئی؟" وہ پھر ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھوں نے دوسری رات بھی ان کے یہاں بسر کی۔ آج بھی دونوں خاموش رہے لیکن تیسری رات حضرت علیؓ نے ان سے مکہ آنے کا مقصد دریافت کیا تو ابوذر نے کہا:

"اگر وعدہ کرو کہ مجھے میرے مطلوب تک پہنچا دو گے تو میں اپنے آنے کی غرض بتا سکتا ہوں۔" حضرت علیؓ کے وعدہ کرنے پر انھوں نے کہا:

"میں دور دراز سے طویل مسافت طے کر کے نئے نبی سے ملنے اور ان کا پیغام معلوم کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔" یہ سن کر حضرت علیؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور بولے "ہاں قسم وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ ...... اور وہ .... دیکھو صبح کو میں جدھر جاؤں میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر میں تمہارے لئے کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہوں، اور جب چلنے لگوں تو میرے پیچھے لگ جانا، اور جہاں جاؤں چلے آنا۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شوقِ دید اور ان پر نازل شدہ وحی کو سننے کی آرزو میں انھوں نے پوری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کو حضرت علیؓ اپنے مہمان کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف چلے، اور کسی طرف مڑے بغیر چلتے رہے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو ابوذر نے کہا:

"السلام علیک یا رسول اللہ!"

"وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلام کا جواب دیا۔

اس طرح ابوذر پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسلامی طریقے سے سلام کیا اور بعد میں سلام و تحیت کا یہی طریقہ مسلم معاشرہ میں عام ہو گیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت رکھی اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا۔ اور انھوں نے کسی پس و پیش کے بغیر کلمۂ حق کا اعلان کر دیا اور اپنی جگہ چھوڑنے سے پہلے ہی دین میں داخل ہو گئے۔ وہ مسلمان ہونے والوں میں چوتھے یا پانچویں شخص تھے۔ انھوں نے حق کی اس سے

داستان کی بقیہ تفصیلات انہی سے سنئے:

"اس کے بعد کچھ دنوں تک میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے میں مقیم رہا۔ اس دوران آپؐ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی، اور قرآن پڑھنا سکھایا۔ پھر فرمایا: "مکے میں کسی شخص کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر نہ ہونے دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تم کو قتل کر دیں گے۔" لیکن میں نے کہا: "جب تک مسجد حرام میں جا کر قریش کے سامنے دعوتِ حق کا برملا اظہار نہ کر لوں، مکہ نہیں چھوڑ سکتا۔" اس کے بعد میں مسجد گیا۔ اس وقت قریش کے لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کے درمیان کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہا:

"قریش کے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، اور محمد، اللہ کے رسول ہیں۔"

جونہی میری آواز ان کے پردۂ سماعت سے ٹکرائی وہ سب بری طرح دہشت زدہ ہو گئے۔ تیزی سے اپنی جگہوں سے اٹھے اور یہ کہتے ہوئے میرے اوپر پل پڑے:

"مارو اس بے دین کو۔" اور مجھے بری طرح زد و کوب کرنے لگے۔ اتنے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عم محترم عباس بن عبدالمطلب کی نظر پڑی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور ان سے بچانے کے لئے میرے اوپر جھک گئے۔ پھر ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

"تمہارا برا ہو۔ تم قبیلہ غفار کے ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جبکہ تمہارے تجارتی قافلے انہی کی طرف سے ہو کر گزرتے ہیں؟" تب جا کر انھوں نے مجھے چھوڑا۔

جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے میری یہ درگت دیکھ کر فرمایا:

"کیا میں نے تم کو اپنے اسلام کے اعلان سے منع نہیں کیا تھا؟"

"یہ میرے دل کی ایک خواہش تھی جو پوری ہو گئی۔" میں نے عرض کیا۔

پھر آپ نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"اپنے قبیلے میں جاؤ۔ جو کچھ یہاں دیکھا اور سنا ہے انھیں بتاؤ اور ان کو اللہ کی طرف بلاؤ۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے سے ان کو فائدہ پہنچائے اور تمہیں اس کا اجر عنایت

فرمائے اور جب سن لینا کہ میں غالب آگیا ہوں تو میرے پاس چلے آنا۔"

جب میں اپنے قبیلے میں واپس آیا تو میرا بھائی انیس مجھ سے ملا اور پوچھا کہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے اس کو بتایا کہ میں محمدؐ کی تصدیق کر کے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کے دل کو قبولِ اسلام کے لئے کھول دیا۔ اس نے کہا: مجھے آپ کے دین سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں بھی اس دین میں داخل ہوتا اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اپنی ماں کے پاس گئے اور انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ تم لوگوں کے دین پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے میں بھی مسلمان ہوتی ہوں۔ اور اسی روز سے اس مسلمان گھرانے نے قبیلۂ غفار میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیا۔ ان کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں بنو غفار کی ایک بڑی اکثریت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی اور ان کے اندر نماز قائم کی گئی۔ البتہ ان کے کچھ افراد نے کہا کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ آئیں گے تو اسلام قبول کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد وہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ اس وقت آپؐ نے کہا:

"غفارٌ غفر اللہ لہا واسلم سالمہا اللہ۔ اللہ تعالیٰ غفار کی مغفرت فرمائے اور اسلم کو سلامت رکھے۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے میں سکونت پذیر رہے یہاں تک کہ بدر، احد اور خندق کے معرکے گزر گئے۔ پھر وہ مدینہ منتقل ہو گئے اور ہر طرف سے کٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو رہے چنانچہ وہ آپ کی صحبت سے متمتع اور آپ کی خدمت کی سعادت سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا لحاظ کرتے اور انھیں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی ان سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب مدینہ منورہ آپ کی پرکشش شخصیت اور نورانی مجالس سے خالی ہو گیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے وہاں ٹھہرنے کا یارا نہ رہا چنانچہ وہ شام کے ایک گاؤں میں چلے گئے اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت تک وہیں مقیم رہے۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں دمشق منتقل ہو گئے

دمشق میں سکونت اختیار کرلی۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان عام طور سے دنیا طلبی میں منہمک اور عیش و عشرت میں غرق اور آخرت سے غافل ہیں۔ اس بدلی ہوئی صورت حال کو انھوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ سختی سے اس کا نوٹس لیا اور نہایت تند و تیز لہجے میں اس پر اعتراضات کرنے لگے۔ لوگ ان کے اس سخت رویے سے تنگ آگئے۔ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ انھوں نے حضرت ابوذر کو مدینہ طلب کرلیا۔ خلیفہ کی طلبی پر وہ مدینہ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی وہ اسی صورت حال کا سامنا کرتے رہے جیسے کہ دمشق میں ان کو سابقہ پیش آچکا تھا۔ وہاں بھی لوگوں کو دنیا کی طرف مائل دیکھ کر بہت جلد بد دل ہو گئے۔ اور لوگ بھی ان کی سخت گیری اور تند و تلخ باتوں سے بے زار ہو گئے۔ آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں "ربذہ" چلے جانے کا حکم دیا۔ "ربذہ" مدینہ کی ایک مضافاتی بستی تھی۔ وہ وہاں منتقل ہو گئے اور لوگوں سے دور، دنیاوی ساز و سامان سے بے نیاز اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے اس طریقے پر چلتے ہوئے زندگی بسر کرنے لگے جو انھوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ان کے گھر میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتا رہا جب اسکو وہاں کوئی سامان نظر نہیں آیا تو ان سے پوچھا: "ابوذر! آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"وہاں آخرت میں ہمارا ایک گھر ہے۔ ہم اپنے اچھے اور بیش قیمت سامان وہیں بھیج دیتے ہیں۔" حضرت ابوذر نے جواب دیا۔ اس آدمی نے انکی بات سمجھتے ہوئے کہا: "پھر بھی، جب تک آپ اس دنیا میں ہیں، زندگی گزارنے کیلئے کچھ نہ کچھ سامان تو ضروری ہے؟"

"لیکن گھر کا مالک ہم کو یہاں نہیں چھوڑے گا" حضرت ابوذر نے کہا۔

ایک دفعہ شام کے گورنر نے اس ہدایت کے ساتھ انکے پاس تین سو دینار بھیجے کہ "انھیں اپنی ضروریات پر خرچ کریں" لیکن انھوں نے یہ کہکر وہ رقم واپس کردی کہ "کیا شام کے گورنر کو مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی شخص نہیں ملا تھا؟"

ہجرت نبوی کے بتیسویں سال گردش زمانہ کے ہاتھوں نے اس عابد و زاہد صحابی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ما اقلت الغبراء ولا اظلت الخضراء من رجل اصدق من ابی ذر۔ "زمین کی پشت پر اور آسمان کے زیر سایہ کوئی شخص ابوذر سے زیادہ سچا نہیں ہے۔" ••

امام رازیؒ اور "مفاتیح الغیب"

عبدالبر اثری فلاحی

تعارف

نام محمد بن عمر بن حسین، کنیت ابو عبداللہ، ابو الفضل، ابو المعالی، نسبت تیمی، بکری، طبرستانی، رازی اور شافعی، القاب فخر الدین، شیخ الاسلام اور امام تھا اور ابن الخطیب کے نام سے معروف تھے۔ آپ خراسان کے ایک گاؤں رَے میں ۲۵ رمضان ۵۴۳ھ/۱۱۴۹ء یا ۵۴۴ھ/۱۱۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ خاص طور سے اپنے والد ضیاء الدین اور کمال سمعانی و مجد جیلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، علم کلام، علم فقہ اور علم حکمت حاصل کیا۔ امام صاحب کا قیام زیادہ تر رَے میں رہتا تھا لیکن آخری عمر میں خوارزم آئے اور وہیں بیمار ہوئے۔ شدت مرض میں ۲۱ محرم ۶۰۶ھ/۱۲۱۰ء میں اتوار کے دن اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر بن علی اصفہانی سے ایک وصیت املا کرائی جسکو طبقات الاطباء اور طبقات الشافعیہ میں بلفظہ نقل کیا گیا ہے۔ پھر مرض نے طول کھینچا، یہاں تک کہ اسی سال یکم شوال کو دوشنبہ کے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)
لیکن آپ کی یہ موت غیر طبعی اسباب کا نتیجہ تھی۔ جیسا کہ مشہور تھا کہ کرامیہ اور آپ کے درمیان مناظرہ و جدال کا بازار گرم تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی توہین و تکفیر کرتے۔ بالآخر کرامیہ فرقے کے لوگوں نے آپ کو زہر دلایا اور اسی زہر کے اثر سے آپ نے وفات پائی۔

علم و فضل

آپ تقریباً تمام ہی علوم و فنون سے کسی نہ کسی قدر واقفیت رکھتے تھے لیکن فلسفہ، علم کلام، علم تفسیر، علم فقہ و اصول فقہ اور علم حکمت میں کمال رکھتے تھے اور انہیں کی وجہ سے آپ نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ ملاحدہ و زنادقہ اور مختلف فرقوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ آپ کا خاص مشغلہ تھا۔ تلامذہ کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جب امام صاحب کی سواری چلتی تھی تو ان کے ساتھ تین سو شاگرد پیدل چلتے تھے۔ انہیں کی وجہ سے فرقہ کرامیہ اور دوسرے فرقوں کے بہت سے لوگ اہل سنت والجماعت کے مذہب میں داخل ہوئے

آپ کمالِ ادب کے اعتبار سے شاعر بھی تھے۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں میں وعظ و شعر کہتے تھے ان کی مجلس میں عام و خاص سب آتے تھے۔ وعظ کی حالت میں ان کو وجد آجاتا تھا۔ بعد کو وہ صوفی بھی ہو گئے تھے اور ان کی حالت میں یہ انقلاب شیخ نجم الدین کبریٰ کی ملاقات کے بعد آیا تھا اور اس کے بعد ہی ان کے ہاتھوں پر توبہ کر کے خلوت نشین ہو گئے۔

تصنیفات و تالیفات

آپ عمر بھر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور تقریباً تمام علوم و فنون پر کتابیں لکھیں حتیٰ کہ جن میں مہارت نہیں تھی ان میں بھی لکھیں۔ انھوں نے خود اپنے وصیت نامہ میں بیان کیا ہے کہ "میں ایک علم دوست آدمی تھا اور ہر فن کے متعلق جس کی کمیت اور کیفیت سے میں ناواقف تھا خواہ وہ حق ہو یا باطل، نیک ہو یا بد، کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔" لیکن ان کی تصنیفات کا جو مطبوعہ ذخیرہ آج موجود ہے ان کا اکثر حصہ فلسفہ، علم کلام اور علم تفسیر پر مشتمل ہے۔ ان کے مصنفات کی تعداد دو سو بتائی جاتی ہے۔ مولانا عبد السلام ندویؒ نے اپنی کتاب "امام رازیؒ" میں اٹھی تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مفاتیح الغیب (جو تفسیر کبیر کے نام سے معروف ہے)

۲۔ اسرار التنزیل و انوار التاویل (چھوٹی تفسیر)

۳۔ تفسیر سورۂ فاتحہ (تفسیر کبیر کی جلد اول یہی ہے لیکن بعض لوگ دو جلد پر مشتمل ایک کتاب "مفاتیح العلوم" کے نام سے سمجھتے ہیں)

۴۔ تفسیر سورہ بقرہ (صرف عقلی طرز پر) ۵۔ تفسیر سورہ اخلاص

۶۔ دلائل الاعجاز۔ ۷۔ المطالب العالیہ (علم الکلام میں)

۸۔ کتاب البیان والبرہان۔ ۹۔ المحصول فی اصول الفقہ

۱۰۔ الملخص (علم فلسفہ میں)

۱۱۔ شرح اشارات ابو علی سینا۔ ۱۲۔ شرح عیون الحکمۃ

۱۳۔ السر المکنون۔ ۱۴۔ شرح المفصل

۱۵۔ شرح الوجیز فی الفقہ للغزالی

تفسیر کبیر

آپ کی سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "مفاتیح الغیب" ہے اور تفسیر کی دنیا میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے لہٰذا اس کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں ہم اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ آپ نے اس کو باریک خط میں ۸ جلدوں میں لکھا تھا۔ بعد میں یہ متعدد بار چھپی۔ ۱۳۰۷ھ میں احمد خلوصی نے اسے آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع کیا جس کے حاشیہ پر تفسیر "ابو السعود" بھی ہے۔ جدید یہ تفسیر حسین طباعت سے آراستہ ہو کر ۱۹۳۴ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان مصر کے مطبعہ البہیہ سے ۳۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے لیکن شہاب نے شفائے قاضی عیاض کی شرح میں لکھا ہے کہ امام صاحب نے صرف سورۂ انبیاء تک کی تفسیر لکھی تھی لیکن مولانا عبد السلام ندویؒ لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور پھر دلیل دیتے ہیں کہ "امام صاحب کی یہ عادت ہے کہ اکثر سورتوں کے خاتمے میں لکھ دیتے ہیں کہ اس سورہ کی تفسیر فلاں وقت فلاں مہینہ اور فلاں سن میں ختم ہوئی اور اس قسم کی تصریحات سورہ انبیاء کے بعد بھی متعدد سورتوں میں ملتی ہیں مثلاً سورہ مومن کی تفسیر کے خاتمے میں لکھتے ہیں کہ "اس سورہ کی تفسیر سنیچر کے دن ۲۰ ذوالحجہ ۶۰۳ھ میں شہر ہرات میں ختم ہوئی۔" اسی مہینے اور اسی سن میں انھوں نے سورہ حم، سورہ شوریٰ، سورہ زخرف، سورہ جاثیہ، سورہ احقاف اور سورہ محمد کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ اور سب کے اخیر میں اسی قسم کی تصریح کر دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ محمد تک تو خود امام صاحب نے تفسیر لکھی ہے لیکن اس کے بعد اس قسم کی تصریحات نہیں ملتیں۔

بہر حال اس کا بڑا حصہ خود امام صاحب نے لکھا ہے۔ اخیر سورتوں کی جو تفسیر رہ گئی تھی اس کی تکمیل سب سے پہلے قاضی شہاب الدین بن خلیل الخویی الدمشقی المتوفی ۶۳۹ھ نے کی اور ان کے بعد شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی المتوفی ۷۲۷ھ نے بھی تکملہ لکھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ قاضی شہاب الدین بقیہ کی تکمیل نہیں کر سکے تھے تو بعد میں شیخ نجم الدین نے بقیہ کی تکمیل کی لیکن اس تفسیر کے جدید ایڈیشن میں امام رازیؒ کے تعارف میں لکھے گئے مقدمہ کے اندر یہ بات درج ہے کہ مشہور محقق دکتور شیخ محمد حسین الذہبی نے امام رازی سے متعلق اپنی کتاب میں آیات و سور کے استقراء اور اصحاب سیر کے مباحث کی روشنی میں اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ

امام صاحب نے خود ہی پورے قرآن شریف کی تفسیر مکمل کردی تھی لیکن ڈاکٹر محترم کے دلائل بصراحت نقل نہیں کئے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے حق میں یہ دلیل ہو کہ اس تفسیر کو پڑھنے والا شروع سے لے کر آخر تک اس کے منہج و مسلک میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ پوری تفسیر ایک ہی اسلوب پر ہے حتی کہ اس میں غور و فکر کرنے والا بھی اصل و تکملہ میں تمیز نہیں کرسکتا ہے اور نہ ہی یہ خیال آتا ہے کہ کتنا امام رازیؒ نے لکھا ہے اور کتنا تکمیل کرنے والوں نے لکھا ہے۔

سبب تالیف

عام طور پر اس تفسیر کا سبب تالیف بتلانے کے لئے علماء تفسیر کبیر کے مقدمہ سے امام رازی کی یہ بات نقل کرتے ہیں کہ "ایک دفعہ میری زبان سے یہ بات نکل گئی کہ سورۂ فاتحہ کے فوائد و نکات سے دس ہزار مسائل نکالے جاسکتے ہیں تو بعض حاسدوں نے اس بات کو مستبعد سمجھا۔ لہٰذا جب میں نے اس تفسیر کا آغاز کیا تو پہلے ایک مقدمہ لکھا تاکہ ثابت ہوسکے کہ جو بات میں نے کہی تھی ممکنات میں سے ہے۔"

لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ مقدمہ لکھنے کا تو سبب بن سکتا ہے مگر پوری تفسیر لکھنے کا سبب نہیں بن سکتا ہے کیونکہ پوری تفسیر آپ نے جواب میں نہیں لکھا ہے بلکہ صرف بطور خاص مقدمہ اس اعتراض کے ازالے کے لئے تحریر فرمایا تھا۔ میری سمجھ سے سبب تالیف وہ امور ہیں جن کی طرف مولانا عبدالسلام ندویؒ نے اپنی کتاب "امام رازی" میں یوں اشارہ فرمایا ہے:

۱۔ امام صاحب کے زمانے سے پہلے ملاحدہ کا ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا جو قرآن مجید پر مختلف حیثیتوں سے اعتراض کرتا تھا اور جابجا اپنے عقائد باطلہ کو خود قرآن مجید سے ثابت کرتا تھا اس لئے اس تفسیر سے ان کے اعتراضات کا اٹھانا مقصود تھا۔

۲۔ تفسیر کے متعلق اسرائیلیات کا جو ذخیرہ موجود تھا وہ بالکل ناقابل اعتماد تھا۔ اگرچہ محدثین نے ان روایتوں کی [illegible] غلطی ظاہر کردی تھی تاہم ضرورت تھی کہ عقلی حیثیت سے بھی ان پر تنقید کی جائے اور ان تنقیدوں میں قرآن مجید کے الفاظ کی مناسبت پر بھی نظر رکھا جائے۔

۳۔ ان سے پہلے معتزلہ، فلاسفہ اور صوفیہ نے قرآن مجید کی جو تفسیریں کی تھیں ان میں بہت سی باتیں عقل کے موافق اور قرآن مجید کے الفاظ کے بالکل مطابق تھیں۔ ارباب نقل نے ان تفسیروں کو بالکل مردود قرار دے دیا تھا حالانکہ ان تفسیروں کی معقول باتوں کو قبول کرتے اور

ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی۔

۴۔ خود قرآن مجید میں جو عقائد مذکور ہیں عقلی طور پر ان کے اثبات کی ضرورت تھی۔

طریقہ تفسیر

امام صاحب کا طریقہ تصنیف یہ ہے کہ وہ جس مسئلے پر لکھتے ہیں اس کے متعلق جس قدر مباحث ان سے پہلے پیدا ہوچکے ہیں ان سب کا استقصا کردیتے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق انھوں نے تفسیر کبیر بھی لکھی ہے اور تفسیر کے متعلق ان کے دور سے پہلے جو کچھ لکھا گیا تھا ان سب کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔ اس لئے ان کی تفسیر میں نحوی، صرفی، ادبی، عقلی، اور متکلمانہ ہر قسم کے مباحث موجود ہیں اور انہیں میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جن کو خالص تفسیر کہتے ہیں۔ پھر ان تفسیری اقوال مختلفہ میں جو قول قابل ترجیح ہوتا ہے اس کو بالدلائل ترجیح دے دیتے ہیں۔ چنانچہ خود تفسیر کبیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"مفسرین کوئی آیت بیان کرتے ہیں تو اس کے متعلق بہت سے متعارض اقوال بیان کردیتے ہیں .... لیکن ہم ایک قول کو باقی اقوال پر دلیل سے ترجیح دیتے ہیں۔"

لیکن یہ ترجیحی وجوہ بھی بالکل عقلی نہیں ہوتے بلکہ:

۱۔ جب کوئی صحیح روایت مل جاتی ہے تو نقل کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں مثلاً "فاذا نفخ فی الصور" (۱۰۱، المؤمنون) کی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے جس کے حق میں حدیث ہے۔

۲۔ صحیح روایتوں کے بعد جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنی مراد لئے جاسکتے ہیں اس وقت اسے حقیقی معنی ہی پر محمول کرتے ہیں اور اس کے مجازی یا عقلی معنی مراد نہیں لیتے جیسا کہ انھوں نے "وفار التنور" (۴۰، ہود) کی تفسیر میں کیا ہے۔

۳۔ عام مفسرین آیتوں کی تفسیر میں جو تفصیلات بیان کرتے ہیں اگر ان کا ذکر خود قرآن مجید میں نہ ہو اور وہ عقلی لحاظ سے معارض ہوتا ہو تو ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے لیکن بایں ہمہ صراحۃً انکار بھی نہیں کرتے۔

مصادر تفسیر

اس تفسیر میں درج ذیل مفسرین کے آراء کو جگہ دی گئی ہے۔ ابن عباسؓ، ابن الکلبی، مجاہد، قتادہ، سدی، سعید ابن جبیر وغیرہ۔

زبان کے معاملہ میں اصمعی، ابوعبیدہ، فراء، زجاج اور مبرد سے استفادہ کیا ہے۔

وہ مفسرین جن سے انھوں نے نقل کیا ہے، مقاتل بن سلیمان المروزی، ابو اسحٰق ثعلبی، ابو الحسن علی بن احمد الواحدی، ابن قتیبہ، محمد بن جریر الطبری، ابو بکر باقلانی، ابن فورک، قفال اور ابن عرفہ وغیرہ ہیں۔

خالص عقلی مسائل میں ابو مسلم اصفہانی، ابو القاسم کعبی، ابو بکر اصم، قاضی عبد الجبار اور صاحب کشاف وغیرہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تطبیق معقول و منقول کے سلسلے میں حکمائے اسلام کی تصنیفات کو پیش نظر رکھا ہے لیکن نام صرف امام غزالی کا لیا ہے۔ بعض ناموں کی طرف شہرزوری نے اشارہ کیا ہے مثلاً یعقوب کندی، ابو زید بلخی، ابو القاسم الحسن بن فضل، الراغب اور عبد الکریم شہرستانی وغیرہ۔

احکام قرآن کے سلسلے میں ابو بکر رازی کی کتاب کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔

خصوصیات

اس کی سب سے بڑی خصوصیت استقصاء اور جامعیت ہے۔ وہ ہر آیت پر نہایت تفصیل سے بحث کرتے ہیں اور ہر آیت پر جس قدر معلومات، اقوال، وجوہات اور دلائل و براہین ہوتے ہیں سب کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفسرین کے اقوال مختلفہ پر ایک تنقید و محاکمہ ہے، اس لئے کہ امام صاحب نے ہر قسم کی تفسیروں کو اپنا ماخذ بنایا ہے اور ان کے اقوال نقل کرنے کے بعد جو قول ان کو دلائل کی روشنی میں راجح معلوم ہوا ہے اس کا انتخاب کر لیا ہے۔

لیکن یہ دلائل بھی خالص عقلی نہیں ہوتے بلکہ لغت، اعراب اور آیت کے سیاق و سباق سے جو قول زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور یہی متکلمانہ طریقہ تفسیر ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت سہل اور آسان ہے۔ ایک بچے کو بھی اس کو سمجھنے میں دقت پیش نہیں آتی حالانکہ وہ فلسفہ و حکمت کے مسائل سے بھری پڑی ہے جس کے مسائل نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں اور جو دقیق الفاظ میں بیان کئے جاتے تھے۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر امام صاحب نے آیات کا باہمی ربط اور سورۃ کا باہمی ربط بیان فرمایا ہے مزید یہ کہ وہ ایک ہی مناسبت بتلانے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ اکثر متعدد مناسبتیں ذکر کرتے ہیں۔

اس کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام رازی اکثر ریاضی، علوم طبیعی اور دیگر علوم جدیدہ کا ذکر کرتے ہیں مثلاً علم الافلاک کا ذکر اکثر ان کے یہاں ملتا ہے۔ وہ فلاسفہ کے اقوال بیان کر کے ان پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ اگرچہ الٰہیات کے مباحث کے دوران وہ خود بھی فلاسفہ کی طرح عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں مگر ان کا استدلال مسلک اہل سنت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اس کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر معتزلہ کے اقوال ذکر کر کے ان پر شدید نقد و جرح کی گئی ہے اور ان کے مذہب کا رد و ابطال کیا گیا ہے۔ بطور خاص کشاف کی روشنی میں اور پھر اہل سنت کے افکار و عقائد کا اثبات بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کٹر سنی تھے۔

اس کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ آیات الاحکام کی تفسیر کرتے ہوئے امام صاحب فقہاء کے مسالک بیان کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید میں بکثرت براہین و دلائل ذکر کرتے ہیں کیونکہ آپ شافعی المسلک تھے اور فقہ حنفی کے دلائل کا اکثر زور و شور سے رد کرتے ہیں۔

اس کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر امام صاحب نے علم الاصول، نحو اور بلاغت سے متعلق مسائل سے بھی بحث کی ہے۔ اگرچہ وہ اتنے نہیں ہیں جتنے ریاضی وغیرہ کے مسائل ہیں اور اسی سے لغوی، نحوی اور بلاغی استدلالات کے لئے اکثر اشعار سے استشہاد بھی کرتے ہیں۔

اس کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر امام صاحب نے مختلف قراتوں سے بھی تعرض کیا ہے۔ بسا اوقات ہر قرأت کے اعتبار سے معانی بھی متعین کرتے ہیں، اور انہی قراتوں کے مطابق آیات کی ترکیب بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی نحویوں کے قول کو قرأت کے لئے حجت بناتے ہیں

اس کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ نقلی حیثیت سے اسرائیلیات کا جو حصہ قابل تنقید تھا اس پر امام صاحب نے تنقید کی ہے اور نہایت قوی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ روایتیں سرتا پا غلط ہیں۔ اول تو ان تمام اسرائیلی روایتوں کو اس اصول کی بنا پر رد کر دیا کہ قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں ان کا مقصد تاریخی حیثیت سے مذکور نہیں بلکہ ان کا مقصد محض پند و موعظت یا حصول عبرت ہے اس لئے ان کی تمام تاریخی خصوصیات کا نمایاں کرنا غیر ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ ان تمام روایتوں سے انکار کیا جن سے پیغمبروں یا فرشتوں کی عصمت و اخلاق پر اعتراض وارد ہوتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی اور اخلاقی حیثیت سے قرآن مجید پر جس قدر اعتراضات ہوسکتے تھے امام صاحب نے ان سب سے تعرض کیا اور کبھی اپنی اور کبھی دوسروں کی زبان سے ان کا جواب دیا ہے اور یہی علم کلام کا علمی پہلو ہے اور غالباً سب سے پہلے اسی مقصد سے علم کلام ایجاد کیا گیا تھا۔

اس کی گیارہویں خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ امام صاحب علوم عقلیہ کا ذوق رکھتے تھے اور عقلی مذاق پر تفسیر لکھی ہے اس لئے اپنی تفسیر میں انھوں نے حدیث پر بہت کم اعتماد کیا ہے حتیٰ کہ اقوال فقہاء کے مباحثہ و مناقشہ کے دوران بھی احادیث سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔

اس کی بارہویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر اسباب نزول کا ذکر کیا گیا ہے خواہ وہ ثابت شدہ ہوں یا غیر ثابت شدہ۔ خاص طور سے وہ جن کی نسبت کسی صحابی یا تابعی کی طرف ہو۔

اہم اعتراضات اور جوابات

اس پر سب سے زیادہ قدیم اور اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں اور سب کچھ تو ہے صرف تفسیر نہیں ہے۔ چنانچہ امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں "صاحب علوم عقلیہ بالخصوص امام رازی نے اپنی تفسیر کو حکماء، فلاسفہ اور ان کے مثل لوگوں کے اقوال سے بھر دیا اور ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف اس طرح نکل گئے کہ دیکھنے والا تعجب کرتا ہے کہ آیت کے موقع و محل سے اس کو کیا مطابقت ہے؟ ابوحیان بحر میں لکھتے ہیں کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بے شمار غیر ضروری باتوں کو یکجا کر دیا ہے جن کی ضرورت علم تفسیر میں نہیں اس لئے بعض علماء نے کہا ہے کہ تفسیر کبیر میں ہر چیز ہے صرف ایک تفسیر نہیں ہے۔"

خود امام صاحب کے زمانہ میں بعض لوگوں نے امام صاحب کی تفسیر پر یہی اعتراض کیا تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے خود تفسیر کبیر میں اس اعتراض کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "کچھ جاہل اور احمق میرے پاس آئے اور کہا کہ "تم نے کتاب اللہ میں علم ہیئت اور نجوم کا ذکر بہت کیا ہے اور یہ خلاف عادت ہے"۔ اور پھر اس کے بعد فوراً ہی متعدد حیثیتوں سے اس کا جواب دیا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھیں ج ۴ صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰ تفسیر کبیر۔

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عقلی اور متکلمانہ مباحث کی ڈھیر میں خالص تفسیری حقائق و معارف تفسیر کبیر میں گم ہوگئے ہیں تاہم یہ کہنا بھی ظلم ہے کہ امام صاحب نے ان حقائق و معارف کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے بلکہ

وہ جیسا کہ ان کا عام انداز ہے ہر آیت کی تفسیر کے متعلق مفسرین کے تمام اقوال کو جمع کر دیتے ہیں اور پھر دلائل سے ترجیح دیتے ہیں۔۔۔ لیکن بایں ہمہ اس میں بہت سے ایسے غیر ضروری مباحث بھی آگئے ہیں جن کو تفسیر سے کوئی تعلق نہیں البتہ اگر ان غیر ضروری مباحث کو حذف کر دیا جائے تو وہ بلاشبہ عقلی و نقلی تفسیر کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔"

اور اسی کی تائید علامہ شبلیؒ کی اس تحریر سے ہوتی ہے کہ "اشاعرہ کے گروہ میں سب سے پہلے امام صاحب نے اس طرز (عقلی طرز) پر تفسیر لکھی اور اس مرتبہ کی لکھی کہ آج تک اس سے بہتر نہیں لکھی جا سکی۔ اگرچہ جیسا کہ ان کا عام انداز ہے وہ وسعت بیان اور تبحر علمی کے رو میں رطب و یابس کی تمیز نہیں کرتے اور سیکڑوں ایسی اوچھی اور سرسری باتیں لکھ جاتے ہیں جو ان کے رتبے کے بالکل شایان شان نہیں ہوتیں تاہم ان حشو و زوائد کے ساتھ سیکڑوں ایسے دقیق اور معرکۃ الآراء مسائل حل کئے ہیں جن کا کسی اور کتاب میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔"

اس پر دوسرا اہم اعتراض جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں، یہ ہے کہ آپ مخالفین کے شدید اعتراضات نقل کرتے ہیں مگر ان کا شافی جواب نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ بعض مغربیوں نے کہا ہے کہ "ان کے وارد کردہ اعتراضات تو نقد ہوتے ہیں لیکن جوابات ادھار۔"

اسی طرح نجم الدین الطوفی اپنی کتاب "اکسیر فی علم التفسیر" میں لکھتے ہیں کہ "میں نے قرطبی اور امام فخر الدین کی تفسیر سے علم تفسیر کی جامع تر اور کوئی تفسیر نہیں دیکھی لیکن امام فخر الدین کی تفسیر میں عیوب بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ سراج الدین مغربی نے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "المأخذ" ہے اور اس میں تفسیر کبیر کی غلطیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں۔ وہ امام رازی پر سخت اعتراضات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مخالفین اسلام کے اعتراضات بڑی تحقیق کے ساتھ نقل کرتے ہیں لیکن ان کے برخلاف اہل سنت کی حمایت کی نہایت کمزور الفاظ میں کرتے ہیں اور بسا اوقات جمہور امت کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں بنا بریں بعض لوگوں نے امام رازی پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ آپ کے عقائد درست نہ تھے لیکن یہ اتہام ہے اور ان کے ظاہری حالات کے مخالف بھی، اس لئے کہ اگر وہ کسی اور مذہب کو مانتے تھے تو اس کے اظہار میں ان کو کس کا ڈر تھا اور ان کے وصیت نامہ سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ امام صاحب مخالف کے اقوال کی نقل و روایت اور اثبات میں اپنا سارا زور بیان صرف کر دیتے تھے لیکن جب اپنی دلیل ذکر کرنے کی نوبت آتی تھی تو ساری قوت ختم ہو چکی ہوتی تھی۔

اس پر تیسرا اہم اعتراض وہ ہے جو احمد امین نے ضحی الاسلام ج ۱، ص ۳۶۹ کے اندر کیا ہے کہ چونکہ یہ تفسیر فلسفیانہ طریق پر لکھی گئی ہے اس لئے اس میں سب کچھ ہے صرف قرآن مجید کی روح نہیں ہے۔

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبد السلام ندوی رقمطراز ہیں کہ "یا وجودیکہ امام صاحب نے عقلی طریقہ دعوت کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے تاہم ان کی تفسیر بالکل روح قرآنی کی جلوہ گری سے خالی نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تفسیر میں عقائد اسلام کا اثبات جن طریقوں سے کیا ہے ہم چند عقائد کے متعلق ان کا خلاصہ درج کرتے ہیں" (اور آگے توحید و رسالت اور آخرت کے متعلق امام رازی کی بحث کو پیش کیا ہے۔)

اور یہ کہنا اس وجہ سے بھی صحیح نہیں ہے کہ بعد میں وہ صوفی ہو گئے تھے۔ توبہ اور خلوت سے نکلنے کے بعد تفسیر کبیر لکھنی شروع کی تھی۔ تو وہ ان کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کے بعد اور علوم کی وقعت ان کے دل سے جاتی رہی اور وہ صرف قرآن مجید کو دینی اور دنیوی سعادت کا منبع سمجھنے لگے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں "اگرچہ میں نے مختلف قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ میں کتابیں لکھیں لیکن اس علم کی خدمت کی وجہ سے مجھ کو مختلف قسم کی جو دینی و دنیوی سعادتیں حاصل ہوئیں وہ اور علوم کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئیں"۔

اختصار یہ تفسیر چونکہ بہت بڑی تھی اس لئے برہان الدین محمد بن محمد النسفی المتوفی ۶۸۸ھ نے اس کا اختصار کیا اور اس کا نام "واضح" رکھا۔ اسی طرح محمد بن قاضی بالموغ نے بھی اس کی تلخیص کی اور اس میں اپنی جانب سے بھی بعض فوائد کا اضافہ کیا۔ اسی طرح تفسیر کبیر کے ایک شاعت ۱۳۵۲ھ میں محمد محی الدین عبد الحمید کی تحقیق کے ساتھ ہوئی لیکن چونکہ یہ سب عام طور سے دستیاب نہیں ہیں اس لئے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دورِ جدید کے مسائل اور اُن کا حل

ترجمانی: محمد اسمٰعیل فلاحی

فتوی نمبر ۳۲۵۶ ۔ تاریخ ۱۳ / ۱۰ / ۱۴۰۰ھ

سوال: ہر فرض نماز کے بعد امام اور دائیں بائیں جو نمازی ہوں انھیں پابندی کے ساتھ سلام کرنا اور ان سے مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

جواب: پانچوں فرض نمازوں کے بعد نمازی کا اپنے امام اور دائیں بائیں بیٹھے نمازیوں کو پابندی سے سلام کرنا اور ان سے مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ یہ نہ تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ خلفائے راشدین سے اور نہ ہی دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم سے۔ اگر یہ چیز ہوتی تو ہم تک ضرور پہنچتی کیونکہ نماز دن میں پانچ بار ہوتی ہے اور یہ فعل مسلمانوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا اس لئے کہ یہ عام مشاہدہ کی چیز ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "جس نے ہمارے دین میں وہ بات ایجاد کی جو اس میں نہیں ہے وہ بات قابل رد ہے"۔ نیز آپ نے فرمایا: "جو ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا عمل نہیں ہے وہ عمل مردود ہے"۔

صلی اللہ علیٰ نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

فتوی نمبر ۲۳۰۲ ۔ تاریخ ۶ / ۱۲ / ۱۴۰۰ھ

سوال: مسجد میں اجتماعی طور پر قرآن پڑھنے کو کیا حکم ہے؟

جواب: سوال مجمل ہے۔ اگر مقصود یہ ہے کہ سب مل کر یک آواز ایک ساتھ پڑھتے اور ایک ساتھ وقف وغیرہ کرتے ہیں تو چونکہ یہ نبیؐ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں ہے اس وجہ سے غیر مشروع ہے اور کم از کم مکروہ تو ہے ہی۔ لیکن اگر تعلیم دینے کی غرض سے ایسا ہوتا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اگر کبھی ہو کر قرآن پڑھنے کا مقصود قرآن یاد کرنا یا اسے سیکھنا ہے، اس طور سے ایک شخص پڑھتا ہے باقی سب سنتے ہیں یا ہر ایک بذات خود پڑھتا ہے نہ وہ دوسروں کے ساتھ وقف وغیرہ کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کی آواز میں اپنی آواز ملاتا ہے تو یہ مشروع ہے، کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرنے اور اسے باہم پڑھنے پڑھانے کے لئے اکٹھا نہیں ہوتی مگر ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔ فرشتے اسے گھیر لیتے اور رحمت خداوندی اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ ملاء اعلیٰ میں کرتا ہے۔ (صحیح مسلم)

فتویٰ نمبر ۴۴۹۴ تاریخ ۱۳/۱۰/۱۴۰۲ھ

سوال: بعض لوگ صبح و شام فجر اور مغرب کی نماز کے بعد اجتماعی طور پر قرآن پڑھتے ہیں کیا ایسا کرنا بدعت ہے؟

جواب: فجر اور مغرب یا کسی بھی نماز کے بعد ایک آواز میں اجتماعی طور پر قرآن کی قرأت کا التزام کرنا بدعت ہے، اسی طرح نماز کے بعد اجتماعی دعا کا التزام بھی بدعت ہے۔

ان سب فتاویٰ کے آخر میں مجلس تحقیقات علمی و افتاء کے دائمی بورڈ کے درج ذیل ممبروں کے نام ہیں:

صدر بورڈ: شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

نائب صدر بورڈ: عبدالرزاق عفیفی

ممبر: عبداللہ بن قعود اور عبداللہ بن غدیان

بقیہ: "روایت پرستی کو ......"

یعنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فرمایا ہے: جب تم سے کوئی حدیث میرے حوالے سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھو، اس کے فان وافقہ فاقبلوہ والا فردوہ مطابق ہو تو لے لو ورنہ رد کر دو۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کی روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ محض اس کے وجوب کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی دلیل کہ کسی روایت میں اگر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہوں تو وہ قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی گویا اطمینان خاطر کے لئے اگر کوئی اس طرح کی روایات کو بھی قرآن کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تو وہ ان کے نزدیک قابل ملامت نہیں بلکہ لائق ستائش ہوگا۔

(جاری)

نعیم الدین اصلاحی

تعارف و تبصرہ

"فکرِ آخرت اور اسلامی انقلاب"

از: مولانا سید احمد عروج قادری، صفحات: ۳۰، قیمت: ۲/۵۰

ملنے کے پتے: (۱) اسٹوڈنٹس اسلامک پبلیکیشنز (۲) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

یہ کتابچہ دراصل مولانا مرحوم کے ان تین مقالات پر مشتمل ہے جو ایس۔ آئی۔ او کے نوجوانوں کے تربیتی اجتماع کے لئے لکھے گئے تھے۔ یہ مقالات ہیں "فکر آخرت اور اسلامی انقلاب"، "مذہب و روحانیت کا محدود تصور" اور "سیرت کا مطالعہ اور اس سے استفادے کا طریقہ"۔

یہ تینوں مقالات مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوعات پر نہایت ہی اہم، جامع اور معلومات افزا ہیں۔ زبان بھی آسان اور شگفتہ ہے۔ ہر معیار کے قاری یکساں طور پر اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں مقالات اور ان کے ذیلی عناوین کی فہرست دے دی گئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہ کتابچہ تحریک اسلامی کے ہر ہر فرد کی نظر سے ضرور گزرنا چاہئے۔

چند تصویریں سیرت کے البم سے

از: خرم مراد، صفحات: ۳۶، قیمت: ۲/۵۰، طباعت: عمدہ،

ناشر: دیدہ و زیب۔

جناب خرم مراد صاحب تحریک اسلامی کے حلقہ میں نہایت ہی معروف ہیں۔ ان کی کئی کتابیں اور تراجم اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جناب خرم مراد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ہی موثر انداز اور دلکش اسلوب میں روشنی ڈالی ہے۔ جسے پڑھ کر ہر قاری کے دل میں نبی صلعم کی ذات سے

عرف گہری عقیدت اور والہانہ محبت ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ آپ کی پاکیزہ زندگی اور مثالی اسوہ کے سانچے میں ڈھل جانے کا بے پناہ شوق اور غیر معمولی ولولہ بھی ابھرتا ہے اور یہی اس مختصر سی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس پڑھئے اور بتائیے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟

"اب ذرا اس تصویر کے آئینے میں اپنے کو بھی دیکھ لیجئے۔ آپ کا بھی دعویٰ ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے، سارے انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں، یہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔ دن رات آپ کی زبانوں پر اسلامی نظام، اقامت دین، حاکمیت الٰہی، شہادت حق کے الفاظ رہتے ہیں۔ سچ بتائیں کہ رات کی تاریکی اور تنہائی ہو یا دن کا اجالا ہو، اب تک کتنی بار ہوا کہ آپ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر آئی ہوں، یہ سوچ کر کہ آپ کے چاروں طرف بسنے والے انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے جب آپ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو آپ کا کیا حال ہوگا (فکیف اذا جئنا بک) یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جس طرح اللہ کے رسولؐ نے ہمارے سامنے حق کی گواہی دی تھی اسی طرح آپ سارے انسانوں کے سامنے دینے کے ذمہ دار ہیں۔ جس طرح وہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے اسی طرح آپ بھی ہوں گے۔ آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ نے اپنے خاندان، اپنے اسکول اور کالج، اپنے محلہ اور دفتر، اپنے شہر اور ملک میں بسنے والے اور گمراہی میں بھٹکنے والے انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دی یا نہیں؟ آپ سچے گواہ تھے یا جھوٹے یا آپ اپنی گواہی کی ذمہ داری سے غافل ہی زندگی گزارتے رہے؟ آپ کو ان سب انسانوں کا درد اور غم تھا یا صرف اپنی دنیا بنانے یا اپنی نجات کی فکر تھی؟" (ص ۱۸–۱۹)

یہ کتابچہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے جو سفر و حضر دونوں میں ساتھ رکھنے کے لائق ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

مولانا سید حامد علی صاحب جامعہ میں

۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ء کو مولانا سید حامد علی صاحب شاہجہاں پوری جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ مولانا کے ساتھ مولانا کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر خالد حامدی فلاحی بھی تھے۔ ابتدا ہی سے مولانا کے جامعہ سے گوناگوں روابط رہے ہیں۔ یوں تو ہر مرحلہ میں مولانا کا مشورہ اور عملی تعاون جامعہ کو ہمیشہ حاصل رہا ہے لیکن خاص طور سے نصاب کی تیاری میں مولانا کا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا بہت دنوں سے جامعہ نہیں آسکے تھے۔ ناظم جامعہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کی صحت عرصہ سے خراب چل رہی تھی (موصوف کی صحت بحمد اللہ اب بہتر ہے) چند ماہ پیشتر ان کی اہلیہ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا جامعہ کی انتظامیہ کے ایک دوسرے رکن اور جماعت اسلامی بلریا گنج کے امیر مقامی حکیم محمد ایوب صاحب کی صحت بھی عرصہ سے اطمینان بخش نہیں ہے۔ مولانا کے دورہ میں ان دونوں بزرگوں کی عیادت اور تعزیت خاص طریقے سے پیش نظر تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا کے بعض پروگرام رکھے گئے۔ ایک بعد نماز عشاء خطاب کا پروگرام دوسرا فجر کے بعد درس قرآن کا تیسرا تعلیمی اوقات میں چند منتخب پر لکچر کا۔ ہم اس شمارہ میں مولانا کے خطابات کے بعض حصے نذر قارئین کر رہے ہیں اگر موقع ملا تو بقیہ پروگراموں کی جھلکیاں آئندہ پیش کی جائیں گی۔

تمہیدی کلمات کے بعد مولانا نے فرمایا: عزیز بیٹو! انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی مضمر ایک بات میں ہے، خود شناسی، آدمی اپنے آپ کو پہچان لے۔ یہ دنیا کا سب سے بنیادی کام اور سب سے مشکل کام ہے۔ ۹۹ فیصد لوگ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔ ہر آدمی کے پاس صلاحیت ہوتی ہے، کوئی آدمی بے صلاحیت نہیں ہوتا۔ وہ کیا ہے، کیا کر سکتا ہے، کیا کرنا چاہئے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، ان چیزوں پر سنجیدگی سے غور کرنا اور ان کو طے کرنا چاہئے انسان کو

کرے گا تو دنیا بھی کامیاب اور آخرت بھی کامیاب۔ نہیں عطا کرے گا، ترجیح نہیں دے گا تو دنیا و آخرت دونوں تباہ ہوں گی۔ پوری دنیا میں امت مسلمہ کی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔ سمجھتے ہیں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے مسلمان ہیں۔ ویسے ہی ایک قوم ہیں جیسے دوسری اور قومیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جو صحیح معنوں میں اسلام کا علمبردار ہو۔"

"یقین محکم عمل پیہم"...... پر کچھ دیر گفتگو کے بعد کہا: "ایک ہوتے ہیں عام کارکن اور ایک ہوتے ہیں رہنما۔ تم رہنما ہو۔ یہ ادارے جن میں آپ تعلیم حاصل کر رہے ہیں یہ کارکن بنانے کے لئے ادارے نہیں ہیں، یہ ملک و ملت کے رہنما بنانے کے ادارے ہیں۔ رہنما، مصلح، علمبردار، لاکھوں انسانوں کو جنت کی راہ دکھانے والے اور جہنم سے بچانے والے۔ ان اداروں میں یہ ایک اچھا ادارہ ہے اس میں خامیاں بھی ہیں مانتا ہوں اور انسانی کاموں میں خامیاں ہوتی ہی ہیں، کبھی انسانی کام خامیوں سے پاک نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ملک کا ایک اچھا ادارہ ہے، بہت اچھا ادارہ۔ اس میں علم دین بھی ہے اور علم دنیا بھی بشرطیکہ آپ اپنے آپ کو پہچانیں۔ آپ یہاں ملک وملت کے رہنما بننے کے لئے آئے ہیں، عام کارکن نہیں۔ کیا اس سے اونچا ہے کوئی اور مقام؟ اب —— امام بخاری کا نام آپ نے سنا ہوگا کیا ان کے اور ساتھی نہیں تھے؟ کون ان کا نام جانتا ہے؟ لوگ نام جانتے ہیں امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام مسلم اور امام ابو حنیفہ کا۔ بارہ تیرہ سو برس گزر گئے آج بھی لاکھوں کروڑوں آدمی ادب اور عقیدت سے ان کا نام لیتے ہیں اور ان کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ احساس کمتری نکال دیجئے، ٹال مٹول مت کیجئے۔ آپ کو اس امت کے مسائل بھی حل کرنے ہیں اور اس ملک کے ڈوبتے جہاز کو ڈوبنے سے بچانا بھی ہے۔ علم کے سلسلے میں امام ابو یوسف کا مشہور مقولہ ہے "اگر کوئی شخص علم کو سارا وقت نہیں دیتا تو علم اسے کچھ نہیں دیتا اگر آپ علم کو پورا وقت دیں گے تو وہ آپ کو تھوڑا سا حصہ دے گا۔" میں آپ سے صاف کہتا ہوں چاہے یہاں کے لڑکے ہوں، ندوہ کے لڑکے ہوں، دیوبند کے لڑکے ہوں کہیں کے ہوں اس وقت عام طور پر مسلمان لڑکوں میں ایک مرض پایا جاتا ہے، گپ بازی، چھپ چھپ کر ناول پڑھنا اور موقع ملے ریڈیو سننا اور مزید موقع ہاتھ لگے تو کرکٹ میں گھنٹوں وقت برباد کر دینا۔ آپ علم دین حاصل کیجئے، کلاس جانے سے پہلے مطالعہ کیجئے، کوئی ناول نہیں، کوئی ٹرانسسٹر اور ریڈیو

نہیں، کوئی گپ شپ نہیں، یہ سب آپ کے دشمن ہیں جو وقت ضائع کرتے ہیں۔ وقت انتہائی قیمتی چیز ہے مقولہ ہے، الوقت سیف قاطع۔ وقت ایک شمشیر براں ہے۔ آپ صحیح استعمال کریں گے تو آپ کی راہ کی تمام مشکلیں ختم کر دے گا، اگر غلط استعمال کریں گے تو آپ کو برباد کر دے گا۔ آپ کی دنیا آپ کی آخرت تباہ ہو جائے گی۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ وقت کم ہے اور بہت کچھ حاصل کرنا ہے کلاس میں جب آپ جائیں تو پوری توجہ سے استاد کی بات سنیں اور نوٹ کریں، یہ بات ٹھیک نہیں کہ امتحان کا وقت آیا تو رات رات بھر رٹ رٹ کر امتحان دے رہے ہیں اور پاس ہو رہے ہیں اگر پکا علم حاصل نہ ہو تو بے کار ہے۔ دنیا و آخرت کی کامیابی اسی علم دین میں ہے۔ آپ علم حاصل کیجئے، یہ مت سوچئے کہ باہر جانا ہے۔ نہیں، آپ کو باہر نہیں جانا ہے، یہیں رہنا ہے، آپ رہنما ہیں، آپ کے ذریعہ ہزاروں اور لاکھوں کو ہدایت ملے گی۔ ہمارے بزرگوں نے سوکھی روٹی دجلہ کے پانی میں بھگو بھگو کر کھائی ہے تب آج موٹی موٹی کتابیں ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں۔ دنیا میں بھی ان کی قدر ہوئی اور انشاء اللہ آخرت بھی کامیاب ہوگی۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے سرمایہ دار تھے ان کے بارے میں کون جانتا ہے، کوئی ان کا نام نہیں لیتا لیکن ان کا نام آج بھی عقیدت سے لیا جاتا ہے اور آئندہ بھی لیا جاتا رہے گا۔ آپ طالب علم ہیں آپ کی دنیا و آخرت کی کامیابی علم اور کردار سے ہے۔ ...... وآخر دعوانا"

مولانا شبیر ازہر میرٹھی

مولانا شبیر ازہر میرٹھی صاحب اکثر جامعہ تشریف لاتے رہتے ہیں۔ آپ جامعہ اشرف العلوم گنگوہ میں استاذ ہیں قرآن کی ایک تفسیر "مقدمۃ القرآن" کے نام سے لکھی ہے جس کے بعض اجزاء شائع ہو چکے ہیں۔ صحیح بخاری کی شرح "تحفۃ القاری" لکھی ہے، زیر تصنیف ہے۔ مولانا اپنے اجتہادات اور نادر تحقیقات کے لئے معروف ہیں اور آپ کی یادداشت بھی ہے۔ اس دفعہ مولانا ۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو تشریف لائے اور فجر کی نماز کے بعد سورۂ کہف کی بعض آیات کا درس دیا جس میں اصحاب کہف پر گفتگو کے ساتھ بعض تفسیری روایات پر اصولی بحث کی۔

سابق امیر جماعت اسلامی جموں وکشمیر

۴ر جنوری ۱۹۸۹ء کو جناب غلام محمد بٹ صاحب، چیئرمین فلاح عام ٹرسٹ

سابق امیر جماعت اسلامی جموں و کشمیر جناب غلام نبی نوشہری صاحب ناظم تعمیرات جماعت اسلامی جموں و کشمیر و سابق ایم ایل اے اور جناب غلام محمد میر صاحب ناظم تعلیمات فلاح عام ٹرسٹ تشریف لائے۔ یہ حضرات کشمیر میں ایک اعلیٰ دینی درسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر مختلف مدارس کا دورہ کرتے ہوئے جامعۃ الفلاح بھی آنا ہوا تاکہ یہاں کے نظام تعلیم و تربیت کو قریب سے دیکھ اور سمجھ سکیں اور اس درسگاہ میں بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں جس کو وہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ان حضرات نے جہاں اساتذۂ کرام اور منتظمین سے تبادلۂ خیال کیا اور طلبہ سے ملاقاتیں کیں وہیں درجوں میں براہ راست پہنچ کر بھی جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اسلام کی نعمت سے نوازا۔ موصوف بلریا گنج کے رہنے والے ہیں۔ ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ بعض تحریکی نوجوانوں سے متاثر ہوئے۔ اسلام کا مطالعہ کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اسلام کے سلسلہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ دارالسلام عمرآباد گئے۔ وہاں سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے دیار مقدس کا سفر کیا۔ وہاں ایم اے کرنے کے بعد اقضیۃ رسول اللہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ کئی سالوں تک رابطہ عالم اسلامی سے منسلک رہے اور اب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حدیث کے استاد ہیں۔ متعدد قابل قدر کتابیں آپ کے قلم سے نکل کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں۔ جامعۃ الفلاح سے آپ کا قلبی تعلق ہونا فطری امر ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ "یہ جامعہ میرا اپنا جامعہ ہے اور میں جامعہ کا ہوں" آپ کے قلبی تعلق کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۵ جنوری ۱۹۸۹ء کو اپنے گھر بلریا گنج آئے اور وقت کی انتہائی تنگی کے باوجود جامعہ، ذمہ داران جامعہ و اساتذۂ جامعہ کی خواہش و دعوت پر جامعہ تشریف لائے۔ فن حدیث پر ایک لکچر بھی دیا۔ موصوف نے فرمایا: "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور وقت عنایت فرمایا کہ آپ کے درمیان بیٹھ سکوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ میں آپ کے سامنے کیا کہوں، اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ میں حدیث کا ایک طالب علم ہوں، حدیث پڑھتا ہوں، اسی کے متعلق سوچتا ہوں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے لکھتا ہوں۔ جو باتیں آپ کے سامنے کہوں گا وہ کوئی نئی باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ جس ماحول میں پل رہے ہیں اور جہاں پڑھ رہے ہیں وہاں لائق اور فائق اساتذۂ کرام

ہیں جو آپ کو ہر وقت اپنے علمی نوادر سے مستفید کرتے رہتے ہیں۔ علم حدیث جو آپ کو معلوم ہی ہے، اسلامی شریعت کے ان مصادر میں سے ایک مصدر ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ اسلام کی اصل بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول ہے۔ سنت رسولؐ گویا اسلام کی دوسری بنیاد ہے لیکن یہ کوئی مستقل اضافی بنیاد نہیں ہے بلکہ پہلی بنیاد کی تکمیل یا اس کی شرح یا اس کے اجمال کی مزید تفصیل بیان کرنے کا مصدر ہے۔"

پھر آپ نے امام شافعیؒ کے حوالہ سے بتایا کہ قرآن کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم تو وہ جو قرآن کے موافق ہے اور قرآن کے مفہوم کی وضاحت کرتی ہے "السنۃ الذی یوافق القرآن"۔ دوسری قسم وہ ہے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے "السنۃ التی بینت من القرآن"۔ تیسری قسم وہ ہے جس کے سلسلہ میں قرآن خاموش ہے یا جو قرآن سے زائد ہے "السنۃ الزائدۃ علی القرآن او ما سکت عنہ القرآن"۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے حدیث رسولؐ کو اپنے سامنے رکھا اور اس عمل کو جاری رکھا۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر کے لئے سب سے پہلے جس چیز پر نظر دوڑائی وہ صاحب قرآن کے اقوال و افعال اور تقاریر[1] ہیں کہ قرآن نے اگر ہم کو کسی بات کا حکم دیا یا کسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے تو قرآن لانے والا اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے۔ اس بات سے بھی دل کو تسلی اور عقل کو اپیل کرتی ہے کہ جو شخص اس قرآن کو لے کر زمین پر آیا اس کی باتیں قرآن کی تفسیر اور اس کی توضیح میں دنیا کے کسی بھی انسان کی بات سے زیادہ معتبر ہوں گی۔

وقت کم ہونے کی وجہ سے تقریر دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ آخر میں سوالات کا سلسلہ تھا جن کا موصوف نے اختصار سے جواب دیا۔

برادر سمیع احمد ایوبی کو صدمہ

یہ خبر قارئین کے لئے درد انگیز ہوگی کہ جامعہ کے ہونہار سابق طالب علم برادر سمیع احمد ایوبی فلاحی کے والد محترم منشی محمد ایوب صاحب کا حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ۹ جنوری ۱۹۸۹ء کو انتقال ہو گیا۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی کام ہوا یا کسی کام کی آپ کو اطلاع دی گئی اور آپ خاموش رہے یا پسندیدگی کا اظہار فرمایا اسے اصطلاح حدیث میں تقریر کہتے ہیں۔ اس کی جمع تقاریر ہے۔

مرحوم صحت مند انسان تھے اور اپنے علاقہ میں بااثر رہے اور ایک بزرگ مسلمان کی حیثیت سے معروف تھے۔ اور وہ حیات تھے۔ برادر کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کا غم جاتا ہے۔ سکریٹری انجمن جاویہ اشرف فلاحی نے بھی ایک خط کے ذریعہ اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ برادر محترم اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں: "وطن اور اعزا سے دور اس حادثہ جانکاہ کی خبر سن کر تو بہت تڑپا لیکن موت پہ کس کو اختیار ہے۔ غم اس بات کا ہے کہ جب میں کسی قابل نہ تھا تو وہ باحیات تھے اور جب میں کسی قابل ہوا تو وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ برسوں سے جو تمنائیں سینے میں دبائے ہوا تھا جب ان کے اظہار اور عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو وہ اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔" یہ ایک غم زدہ اور دکھی بیٹے کے جذبات ہیں۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ اس موقع پر ایک حدیث یاد آتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا مات الانسان انقطع عملہ الا من ثلاث صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعو لہ۔

"حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ تین طرح کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی اسے ملتا رہتا ہے۔ ایک یہ کہ مرنے سے پہلے صدقہ جاریہ کر جائے، دوسرے یہ کہ ایسا علم چھوڑ جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرا کام یہ کہ آدمی کی تربیت کے نتیجہ میں اولاد نیک ہو اور اپنے مربی کے لئے دعا کرے۔"

جامعہ کا وفد مصباح العلوم چوکونیاں بستی میں

چوکونیاں، بھارت بھاری، ضلع بستی میں واقع مصباح العلوم جامعۃ الفلاح کی ایک شاخ ہے۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بستی میں یہ ایک ممتاز ادارہ ہے جس میں عربی سوم تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اساتذہ پڑھانے میں کافی محنت کرتے ہیں۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ بھی زائد وقت دیتے ہیں۔ تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ کھانے پینے کا بھی نظم معقول ہے۔ ایک دیہات میں ہونے کی وجہ سے نام نہاد تمدن کی پیدا کردہ بہت ساری خرابیوں سے دور ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود اس کے ذمہ داروں کی کوششیں قابل قدر اور ان کے اخلاص کی دلیل ہیں۔ اگر اس کے اساتذہ اور منتظمین اسی طرح اخلاص، خیرخواہی اور محنت کے ساتھ

کام کرتے رہے تو مستقبل قریب میں اس سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ تعلیم و تربیت کے معاملہ میں جامعۃ الفلاح اس ادارہ کی سرپرستی کرتا ہے۔ صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی، انچارج علمی مولانا ارشد الاشرفی صاحب فلاحی، استاذ گرامی ماسٹر عبداللہ صاحب ایم۔ اے اور مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی پر مشتمل ایک وفد ۳۰ جنوری ۱۹۸۹ء کو تعلیم و تربیت کا جائزہ لینے مصباح العلوم پہنچا۔ ضلع بستی میں چھوٹے چھوٹے مدرسے بہت ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں تاکہ ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور کوشش کی جائے کہ نظام تعلیم و تربیت ایک ہو۔ وفد کے معزز ارکان اس مقصد کی خاطر جامع العلوم سنتشی، ڈومریا گنج بستی، درسگاہ اسلامی گردیہا بستی اور جامعۃ الحق السلفیہ انسی، بستی بھی گئے اور تعلیم و تربیت سے متعلق مناسب مشورے دیئے۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

گزشتہ شمارے میں جمعیت کی سرگرمیوں کے ضمن میں جمعیت کی جانب سے منعقد ہونے والے متعدد مقابلوں کی روداد پیش کی گئی تھی۔ آج تقریری و تحریری مقابلوں کی تفصیلات ہم آپ کو سنائیں گے۔ دعوت و تبلیغ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سلسلے میں خطابت کی کیا اہمیت ہے، وہ کتنی بڑی طاقت کا نام ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہ اثر رکھتی ہے کہ گروہوں کو لڑا بھی سکتی ہے اور ملا بھی سکتی ہے۔ مردہ دلوں میں اس سے زندگی کی لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔ اہل حق بھی اس سے کام لیتے ہیں اور اہل باطل بھی۔ یہی حال تحریر کا بھی ہے بلکہ ایک شخص کسی گوشے میں بیٹھ کر لکھتا ہے اور اس کی تحریر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتی ہے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور اپنے نظریات کو پھیلانے میں ان دونوں کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں کو ان دونوں پر ملکہ حاصل ہو تاکہ باطل کا شیرازہ منتشر کرنے اور حق کو عام کرنے میں وہ ان سے مدد لے سکیں۔ اس صلاحیت کو پروان چڑھانے کے لئے اردو، عربی اور انگریزی کے ہفتہ وار اور ماہانہ پروگرام طلبہ کی جمعیت خود چلاتی ہے۔ مزید ترغیب و تشویق کے لئے مقابلے کا پروگرام بھی رکھا جاتا ہے۔ اس بار ان مقابلوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ یہ ہیں:

اردو تقریری مقابلہ: درجہ ششم اوّل: محمد ہارون نیپالی بعنوان "مقصد تعلیم"

سراج احمد، بھنگوی II بعنوان "اتحاد" ۔ سراج الدین گیاوی III بعنوان "اسباب زوال امت"۔

درجہ ہفتم وہشتم ثانوی: محمد خورشید نیپالی درجہ حفظ I بعنوان "وجاہدوا فی اللہ حق جہادہ"۔

عبدالسلام نیپالی ہشتم II بعنوان "اتحاد و اتفاق"۔ فیروز احمد نیپالی ہشتم III بعنوان "علم کی اہمیت"۔

عربی اول: جاوید احمد اعظمی I بعنوان "مشکل کرنا تقاضوں سے اداکرے تم تبھی"۔

حمید اللہ سیوانی II بعنوان 〃

جلال الدین بستوی III 〃 "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"

عربی دوم: مزمل الحق نیپالی I بعنوان "اسلام کے تقاضے اور نوجوان"

ابوصالح فیضی اعظمی II 〃 〃

محی الدین غازی اعظمی III 〃 〃

اردو تحریری مقابلہ: عربی سوم: عبدالودود رام پوری I بعنوان "حسن البناء شہید اور ان کے کارنامے"۔ اثیر احمد اعظمی II بعنوان "دین الٰہی اور اس کی ناکامی کے اسباب"۔

نذر تاج احمد جونپوری III 〃 〃

عربی تقریری مقابلہ: عربی اول و دوم: اکرام الرحمٰن دھوبی عربی اول I بعنوان "تقوےٰ دینا کی بنیاد"۔ محی الدین غازی اعظمی عربی دوم II بعنوان "انقلاب"۔ ابوصالح فیضی اعظمی عربی دوم III بعنوان "اسلام کی نشر و اشاعت میں ہماری ذمہ داریاں"

عربی سوم و چہارم: محمد ادریس نیپالی عربی چہارم I بعنوان "ہندوستان کے موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں"۔ شمر عالم مظفر پوری II 〃 "ان الدین عند اللہ الاسلام"۔

محمد عامر نیپالی عربی چہارم III 〃 〃

انگریزی تقریری مقابلہ: عربی اول و دوم: ابوبکر صدیق حیدرآبادی عربی اول I بعنوان "تعلیم کا مقصد"۔ اکرام الرحمٰن دھوبی عربی اول II بعنوان "دینی تعلیم"۔ حمید اللہ سیوانی عربی اول III بعنوان "امت مسلمہ کی ذمہ داریاں"

عربی سوم و چہارم: شمر عالم مظفر پوری عربی چہارم I بعنوان "موجودہ دور میں ہماری ذمہ داریاں"

منور عالم چمپارنی II 〃 "سچے مسلمان کا کردار"

محمد ادریس نیپالی عربی چہارم III بعنوان "موجودہ دور میں ہماری ذمہ داریاں"

عربی پنجم تا عربی ہفتم: عزیز الرحمٰن سنبھلی عربی ششم I "اسلام میں مساوات"

موسیٰ کلیم حیدرآبادی عربی پنجم II بعنوان "ہماری تعلیم کا مقصد"

ریاض الدین گونڈوی 〃 ششم III "اسلام میں مساوات"

امتحانات

سالانہ امتحانات کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ ناظم امتحان مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب اور نائب مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی ہیں۔ طے ہوا ہے کہ ۹ مارچ ۱۹۸۹ء سے اسباق بند ہو جائیں اور ۱۰ مارچ ۱۹۸۹ء کو پہلا پرچہ ہو، ۲۹ مارچ ۱۹۸۹ء کو آخری پرچہ ہوگا۔ پھر طلبہ گھروں کو روانہ ہو جائیں گے۔ اساتذہ کرام یکم اپریل ۱۹۸۹ء تک رک کر نتائج تیار کریں گے۔

آزاد ہند

از شیخ منقصت مبارکپوری

فرنگی غاصبوں کو ہم نے جب باہر نکالا ہے
وطن میں اب تو اپنوں ہی کا یکسر بول بالا ہے

مرے دل کی کوئی امید لیکن بر نہیں آتی
ابھی تک ظلم ہی آزاد ہندوستاں میں پالا ہے

ہوا جاتا ہے ہر دو سر یہاں ان کے تغافل سے
وہی حرفِ تمنا جس کو ہم نے دل میں پالا ہے

جو ہیں کمزور، ناتواں انہیں جینے نہیں دیتے
یہاں ہر فرد میرے دیس کا بالکل نرالا ہے

سیاہ بند خود غارت گر اہل وطن اب ہے
شکست بے رحم لوگوں سے ہمارا آج پالا ہے

دلوں میں ظلم و رشوت سے سیاہی ہوگئی پیدا
وہ حاکم کون ہے جس کے بھی دل میں اجالا ہے

یہاں تعمیر ہوتی ہے وطن کی آتش و خوں سے
ابھی نے ترقی کا نیا رستہ نکالا ہے

یہاں بے دردیوں سے جن کی چاہیں ہڈیاں توڑیں
یہاں پولیس کے ڈنڈوں ہی کا اب بول بالا ہے

یہاں ہر شہر و قریہ میں ہے ظلم و جور کی شاہی
مزاج حکمرانی ہند میں بالکل نرالا ہے

ابھی مسجد کو بت خانہ بنایا ہے عدالت نے
ابھی کیا، دیکھو آگے کیا کیا ہونے والا ہے

یہاں ہر جگہ ظلم و ستم کی حکمرانی ہے
یہاں قانون کیا ہے، مجرموں کا گھر یا جالا ہے

یہاں جمہوریت کا نام جو زندہ ہے اے منقصت
ستم کی بالادستی پر اسی نے پردہ ڈالا ہے